چوتھا باب

گریز کی راہیں

خواہش فرار کا دباؤ:

ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ایسے شخص کے لیے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھتا ہو، جو مسلمان ہی مرنا چاہتا ہو اور جس کو کل قیامت کے دن اپنے فَریضہِ حیات کی بابت جواب دہی کا پورا احساس ہو۔ نیز جسے اس بات کا یقین ہو کہ کلام الٰہی جو کچھ فرماتا ہے، عروج وزوال عزت ودولت کے جو فلسفے بتاتا ہے وہ انسانی عقل کے گھڑے ہوئے فلسفوں کی طرح گمان وقیاس پر مبنی نہیں ہیں۔ بلکہ اس کی بنیاد حقیقت نفس الامری پر رکھی گئی ہے، وہ حق ہے، سراپا حق ہے، ایسے شخص کے لیے اس کے سوا اور کوئی راہ قابل اختیار رہ ہی نہیں جاتی کہ ہر طرف سے اپنی آنکھیں پھیر کر ہر آواز کے لیے اپنے کان بند کر کے نفس کے ہر فریب اور شیطان کے ہر وسوسے سے دل کو پاک کر کے اور تمام اندیشوں سے بے پرواہو کر صراط مستقیم پر اپنے قدم مضبوطی سے جمالے اور اپنے جسم ودماغ کی ساری قوتیں دین حق کے قائم کر دینے میں لگادے، وہ اپنے فہم وتدبر سے کام لے کر اس کے لیے مناسب وقت تدبیریں سوچ سکتا ہے، حالات زمانہ کے لحاظ سے ایک خاص طریقہ عمل اختیار کر سکتا ہے۔ ماحول کے تقاضے سے کوئی پالیسی مرتب کر سکتا ہے لیکن یہ ہر گز نہیں کر سکتا کہ اپنے نصب العین اور مقصد حیات ہی میں کوئی ترمیم کر لے۔ یا اس کو ملتوی کر دے یقیناً اس طرح کی کوئی بھی کاروائی اس کے اختیار سے باہر ہے وہ اس راہ سے ہٹ کر اور اس نصب العین کو چھوڑ کر جو قدم بھی اٹھائے گا وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے بغاوت کا، اور ملی خود کشی کا قدم ہوگا۔ اس وقت اس کی مثال اس نادان اندھے کی سی ہوگی، جو کسی گہرے کھڈ کی طرف بڑھ رہا ہو اور اس کا بہی خواہ رہنما چلا چلا کر اسے ادھر جانے سے منع کر رہا ہو اور صحیح راہ پر لانے کی کوشش کر رہا ہو۔ مگر وہ ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنے اس رہنما کی باخبری، راست گوئی، اس کی خیر خواہی اور اس کے خلوص کا قصیدہ پڑھ رہا ہو اور دوسری طرف اسی سمت بڑھے جانے پر محض اس لیے اصرار بھی کر رہا ہو کہ اس سمت کی زمین اسے کچھ ڈھلوان معلوم ہو رہی ہے۔ جس پر قدم آسانی کے ساتھ پڑتے جا رہے ہیں اور اس کی مخالف سمت کی زمین کچھ بلند دکھائی دیتی ہے جس پر قدم رکھنے میں چڑھائی کی دقتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔

لیکن بد قسمتی سے بحثیت مجموعی آج یہ امت بالکل اسی اندھے کا پارٹ ادا کر رہی ہے وہ ہر اس سمت دوڑ پڑنے کے لیے تیار ہے جس پر کسی قوم کو سرگرم سفر دیکھ پائے۔ بشرطیکہ یہ راہ اسے سہل اور ہموار اور دلکش دکھائی دیتی ہو چاہے وہ ٹھیک ہلاکت ونامرادی کی جہنم ہی تک کیوں نہ لے جاتی ہو۔ اگر کسی سمت اس کے قدم اٹھنے سے انکار کرتے ہیں تو وہ وہی سمت ہے جو اقامت دین کی سمت کہلاتی ہے، اور یہ صرف اس لیے کہ یہ راہ اس کو مشکلات کے کانٹوں سے بھری ہوئی دکھائی پڑتی ہے۔ قرآن اس کو دوسری تمام راہوں سے روک کر اسی راہ کی طرف بلاتا ہے، مگر وہ سنی ان سنی کر دیتی ہے وہ کہتا ہے کہ میں ہی تیرا بہی خواہ ہوں وہ جواب دیتی ہے کہ یہی ہمارا ایمان ہے، وہ کہتا ہے کہ میں ہی تیرا ہادی اور نجات دہندہ ہوں وہ جواب دیتی ہے کہ اس سے کس کافر کو انکار ہے؟ وہ کہتا ہے میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا، کبھی غلط بات نہیں کہتا، کبھی اپنے دعوؤں کی بنیاد وہم وگمان اور اٹکل پچو پر نہیں رکھتا، وہ جواب دیتی ہے کہ لاریب، وہ قرآں کہتا ہے میرے پاس اور صرف میرے پاس علم حقیقت ہے میں ہمیشہ صحیح راہ بتاتا ہوں، تمہاری اور ساری انسانیت کی نجات کا راز صرف میری تعلیمات میں مضمر ہے۔ وہ جواب دیتی ہے کہ "بلاشبہ" وہ کہتا ہے کہ جو کچھ میرے سوا ہے باطل ہے، جو کچھ میرے خلاف ہے سراسر جہل ہے۔ جو کچھ مجھ سے ہم آہنگ نہیں، اس مین تباہی ونامرادی کے علاوہ کچھ نہیں۔ وہ جواب دیتی ہے

کہ یقیناً لیکن جب وہ یہ کہتا ہے کہ تیرے لیے میرے پاس صرف ایک وصیت ہے، اقامت دین کی وصیت تو اس کی زبان جواب تک اس کے ہر دعوے کی تصدیق میں اتنی تیز تھی، معاً بند ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ ان کا نفس حیلوں اور تاویلوں کا لشکر تیار کر کے سامنے آجاتا ہے تا کہ اس اضطراب کو کچل ڈالے، جو اس منافقانہ خاموشی کے باعث اس کی روح کی گہرائیوں میں رونما ہوتا ہے مجرم انسان اگر اس کے اندر غیرت و عزت نفس کی کوئی رمق باقی ہو، لوگوں کے سامنے مجرم کی حیثیت سے آنا کبھی گوارا نہیں کرتا اگر اس غیرت اور عزت نفس کی حس میں احساس فرض کی حرارت بھی موجود ہوتی ہ تو وہ اسے مجبور کر دیتی ہے کہ اپنے جرم کا کفارہ ادا کرے اور اپنے عمل کے ذریعے اپنے دامن سے اس داغ کو دھو ڈالے اور اگر یہ صورت حال نہیں ہوتی اور اس کا سینہ اس حس اور اس احساس سے خالی ظاہر ہوتا ہے تو پھر اس کی تمام دماغی قابلیتیں اس بات پر صرف ہونے لگتی ہیں کہ کس طرح اس جرم کو عین حق و صواب ثابت کر دے اس وقت اس کا نفس اسے بے گناہی کا فریب دینے میں ہمہ تن مشغول ہو جاتا ہے اور اس کے حکم سے اس کا دماغ تاویلوں کی ایک خوشنما نقاب تیار کر دیتا ہے جس کو وہ اپنے چہرے پر ڈال کر اپنے آپ کو یہ محسوس کرا لیتا ہے کہ میں بر سر غلط قطعاً نہیں ہوں اس کے بعد اس کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ دوسروں کو بھی ایسا ہی محسوس کرا دے تا کہ اس کے داغ گناہ کی طرف کوئی انگلی اٹھانے والا نہ رہ جائے۔ ٹھیک یہی حال ہے اپنے فریضہ ملی اور مقصد زندگی کی بجاآوری میں امت مسلمہ کا۔ وہ اپنے فرض کو چھوڑ بیٹھنے پر اسی قسم کے ادعائے بے گناہی کا مظاہرہ کر رہی ہے صدیوں کے انحطاط اور زوال نے اس کے احساس فرض کو بری طرح کچل کر رکھ دیا ہے اور ان بلند جذبات سے اس کا سینہ تقریباً اجڑ گیا ہے جو کسی نصب العین کی بجاآوری کے لیے ضروری ہوا کرتے ہیں۔ خصوصاً اقامت دین کے نصب العین کے لیے جو کبھی بھی آسان نہ تھا اور جس میں جان و مال کی بازی، عیش و آرام کی قربانی اور امیدوں اور تمناؤں کی پامالی شرط اول قدم ہے اس لیے بجائے اس کے کہ وہ اپنے جرم کو تسلیم کر کے تلافی کی کوشش کرتی اور اپنے نصب العین کو سنبھال لیتی، سرے سے اپنی کوئی ذمہ داری ہی نہیں تسلیم کرنا چاہتی۔ بلکہ طرح طرح کی دور از کار تاویلوں سے اپنے رہے سہے احساس کو بھی دباتی جا رہی ہے۔ یہ تاویلیں مختلف قسم کی ہوتی ہیں اور مختلف لوگ ادائے فرض کے مطالبے پر جواب میں مختلف معذرتیں پیش کرتے ہیں۔ چونکہ یہی تاویلیں اور یہی معذرتیں دوسرے لفظوں میں فرار اور گریز کے یہی "فلسفے" امت کے ۹۹ فیصد سے زیادہ افراد کے لیے حجاب نظر بنے ہوئے ہیں اور جب تک ان کی بے حقیقتی واضح نہیں کع دی جاتی کہ ان کا اپنے فرض کی طرف پلٹ آنا محال سا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان کا جائزہ لیا جائے اور پھر ان پر تنقید کر کے بتا دیا جائے کہ فی الواقع ان کی کیا قدر و قیمت ہے؟

گریز کے "فلسفے"

جہاں تک عام جائزے کا تعلق ہے یہ تاویلیں یا گریز کے یہ "فلسفے" پانچ ہیں:۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ عمل کرنے والے کے لیے کسی حال میں بھی اپنی واقعی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہو جانے کی راہ بند نہیں۔ چانچہ جن کو اللہ تعالیٰ نے حسن عمل اور خشیت وانبت کی توفیق بخشی ہے وہ آج بھی دنیا پر ٹھیک ٹھیک عامل ہیں، اپنے فریضے کو انجام دے رہے ہیں، اور امر بالمعروف کرتے رہتے ہیں۔ رہ گئے قرآن و سنت کے اس طرح کے اجتماعی احکام، جن کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے تو ان کا تعلق اسلامی حکومت سے ہے، دین کی اقامت کر رہے ہیں، حق کی شہادت دے رہے ہیں اور اس کے مخاطب مسلمانوں کے اولوالامر ہیں۔ عوام نہیں ہیں۔ اس وقت چونکہ اسلامی حکومت قائم نہیں ہے اس لیے ان احکام کے اجراء و نفاذ کی ذمے داریوں کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور اگر کچھ احکام ایسے ہیں بھی جن کا تعلق براہ راست عام افراد سے ہے لیکن جن پر عمل نہیں ہو رہا ہے، مثلاً غیر اسلامی عدالتوں سے معالات کا فیصلہ نہ کرانا اور غیر اسلامی قوانین کے مطابق فیصلے

نہ کرنا وغیرہ، تو ایسا وہ اضطراراً کر رہے ہیں۔ اور یہ شریعت کا ایک عام اصول ہے کہ اضطرار کے وقت ناجائز کام بھی مباح ہو جاتے ہیں۔ اس لیے قرآں کے ایک حصے کو چھوڑ بیٹھنے اور اقامت دین کا فریضہ بھول جانے کا عمومی الزام صحیح نہیں ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ بلاشبہ ملت اسلامیہ کا مقصد وجود یہی اقامت دین ہی ہے لیکن موجودہ ناسازگار حالات میں اس نصب العین کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے، لہذا اس وقت اس کی خاطر جدوجہد کرنا وقت اور قوت کو ضائع کرنا ہے اور دنیا کے سامنے اسے علانیہ پیش کرنا صرف مصلحت کے خلاف اور ناعاقبت اندیشی کی دلیل ہی نہیں ہے بلکہ مفاد ملت کے لیے سراسر مضر اور مہلک بھی ہے۔ اس لیے سردست خدمت دین کی کچھ ایسی جزئی تدبیریں اختیار کی جانی چاہیئیں جو ممکن العمل ہوں اور تجربے سے دین کے احیاء میں مفید ثابت ہو چکی ہوں اور جو آگے چل کر ہمارے اس نصب العین کے لیے حالات کو نسبتاً کچھ زیادہ سازگار بنا دینے والی ہوں۔ پھر جب یہ آج کے حالات بدل جائیں گے اور ہمارے اس مشن کے لیے وہ اتنے ناسازگار نہ رہ جائیں گے جتنے کہ اب ہیں، اس وقت اس کے لیے براہ راست جدوجہد شروع کی جائے گی۔

تیسرے گروہ کا انداز فکر یہ ہے کہ اس نصب العین کے برحق ہونے میں کوئی کلام نہیں، مگر اس کے لیے صدیق اور فاروق درکار ہیں، اور ہم ایسے بن نہیں سکتے، اس لیے ہمارے بس کا یہ کام ہی نہیں ہے۔ جس مشن کو پیغمبر ﷺ کی تربیت یافتہ جماعت بھی تیس برس سے زیادہ نہ چلا سکی۔ اس کے لیے ہم جیسے ضعیف الایمانوں کا دم خم دکھانا تقدیر سے لڑنا ہے اب وہ زمانہ نہیں آسکتا جو تیرہ سو برس پہلے گزر چکا۔

چوتھا گروہ یوں سوچتا ہے کہ کام کی کوئی راہ کھلے اور کوئی قافلہ اس پر کامیاب گامزنی کا مظاہر کرے تو ہم بھی اٹھ کر کھڑے ہوں گے۔ گویا کسی جدوجہد کا شروع ہو جانا بھی ان کے لیے اقدام کو ضروری نہیں ٹھیرا سکتا، بلکہ یہ اقدام ان کے لیے صرف اس وقت ضروری ہوگا، جب کہ کچھ لوگ آگے چلنے والے انہیں نظر آجائیں اور وہ مضبوطی اور ثابت قدمی دکھا کر ایک حد تک راستے صاف بھی کر دیں، جب تک ایسا نہیں ہو جاتا اس کے لیے اس جدوجہد میں شریک ہو جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو حضرت امام مہدی کے آنے کے منتظر بیٹھے ہیں اس گروہ کو اگرچہ اس نصب العین کے برحق ہونے سے اختلاف نہیں۔ مگر اس کے سوچنے کا انداز کچھ اس طرح کا ہے کہ اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے امام مہدی کے بھیجنے کا وعدہ فرمایا ہے اور انہی کی زیر سرکردگی یہ مہم چلائی جائے گی۔ ان کی آمد سے پہلے اس کام کی عام امت پر کوئی خاص ذمے داری ہے ہی نہیں۔ اس لیے ہم خواہ مخواہ یہ درد سر نہیں خریدنا چاہتے۔

یہ سارے گروہ اور ان کے خیالات مسلمانوں کے ان حلقوں سے تعلق رکھتے ہیں جو مذہبی اور دیندار حلقے کہے جاتے ہیں، رہ گئے وہ لوگ جو دین کے قلاوے کو اپنی گردن سے عملاً اتار کر پھینک چکے ہیں اور جو اپنے مسائل زندگی میں قرآن و سنت کو اتھارٹی تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہیں۔ تو ان کے خیالات سے تعرض کرنا فضول ہے کیونکہ وہ اس بات کے حق دار ہی نہیں کہ اس بحث میں ان کی باتوں کو بھی کوئی جگہ دی جائے بلکہ وہ شاید خود بھی اسے پسند نہ کریں۔

اب آیئے ترتیب وار ہر گروہ کے خیالات کو دلائل کی میزان میں تول کر دیکھیں تا کہ ان کا صحیح وزن معلوم ہو سکے اور یہ بات کھل کر سامنے آجائے کہ آیا ان تاویلوں میں سے کوئی تاویل بھی ایسی ہے جس سے واقعتاً ہماری ذمے داری اور مسئولیت کچھ ہلکی ہو جاتی ہے۔

ا۔ دین کے جزوی اتباع پر اطمینان

پورے مجموعہ شریعت کی پیروی کا جواب:

اس امر کا دعویٰ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ قرآن و سنت میں صرف نماز، روزے اور حج وزکوٰۃ ہی کے فرائض کا ذکر ہے اور مومنہ سے صرف انہی احکام کی بجاآوری کا مطالبہ کیا گیا ہے، اسی طرح یہ کہنے کی بھی کوئی جسارت نہیں کر سکتا کہ عبادات اور اخلاق کے ماسوا جو احکام ہیں وہ (نعوذ باللہ) محض بھرتی کے مضامین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بخلاف اس کے یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ کتاب و سنت میں جو احکام ہیں وہ بندگی کا ایک جامع نظام اور زندگی کا ایک جامع ضابطہ ہیں اور ان کا ایک ایک جزو اتباع اور عمل ہی کے لیے ہے۔ آپ ان میں علمی طور پر جو فرق مراتب چاہیں کر لیں اور ان کے اجر و ثواب میں بھی باہم جو نسبت چاہیں متعین کر لیں۔ لیکن عملی طور پر کسی تفریق کے نہ آپ حقدار ہیں اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔ ایک غلام کا فرض اپنے آقا کے ہر چھوٹے بڑے حکم کی تعمیل ہے۔ اس کو یہ حق کبھی نہیں پہنچتا کہ ضروری اور غیر ضروری کی بحثیں پیدا کر کے بعض حکموں کو تو مانے اور بعض سے بے رخی برت جائے۔ آقا کا حکم بہر حال حکم ہے، جسے ہر صورت میں پورا ہونا چاہیے۔ مسلمان نے بھی اللہ تعالیٰ کی کامل بندگی اور ہمہ وقتی غلامی کا عہد کیا ہے۔ اب اگر (بطور مثال) اس آقا کی طرف سے اس کے پاس دو حکم آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ نماز پڑھو۔ دوسرا یہ کہ چور کے ہاتھ کاٹ دو۔ تو اس کا فرض ہے کہ وہ یکساں توجہ کے ساتھ ان دونوں حکموں پر عمل کرے اس لیے کہ وہ ان میں سے پہلے حکم پر عمل کرتا ہے اور دوسرے کو سن کر خاموش ہو رہتا ہے۔ تو کون ہے جو اس کے اس طرز عمل کو اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور اس کی کتاب الاحکام.............. قرآن................. کی پوری پابندی قرار دے سکے پھر یہ کیا ستم ہے کہ قرآن کے ایک دو نہیں بیسیوں احکام معطل ہو کر رہ گئے ہیں اور پھر بھی ہمیں خوش فہمی ہے کہ ہم اتباع دین کے مطالبے سے پوری طرح عہدہ برآ ہو رہے ہیں؟

سیاسی اقتدار سے محرومی کا عذر

رہا یہ عذر کہ ہم تو ان احکام کے سرے سے مکلف اور مخاطب ہی نہیں، ان کے نفاذ کی ذمے داری تو مسلمانوں کے اولوالامر پر ہے۔ آج چونکہ اسلامی حکومت موجود نہیں اس لیے ان احکام کے نافذ کرنے کا سوال ہی باقی نہیں رہ گیا ہے اور اس وقت یہ ذمے داری ہی ساقط ہے.............. تو یہ کھلا ہوا عذر گناہ ہے اور ایسا عذر گناہ جو خود اس گناہ سے بھی بدتر ہے۔ قرآن میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اے مسلمانوں کے اولوالامر! تم چور کے ہاتھ کاٹ دو یا یہ کہ اے اسلامی حکومت کے ذمے دارو! تم زانی کو کوڑے مارو۔ بلکہ اس طرح کے قوانین کا اور ان کے نفاذ کا جب وہ حکم دیتا ہے تو مخاطب پوری امت کو بناتا ہے مثلاً آیت سرقہ ہی کو لے لیجیے جس کے الفاظ یہ ہیں:

والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما (مائدہ:۴)

"چور مرد و چور عورت کے ہاتھ کاٹ دو۔"

ان لفظوں کے اندر اگرچہ یہ صراحت نہیں کہ خطاب اس حکم کا کن سے ہے؟ مگر دو وجوہ یہاں ایسے ہیں جن کے باعث بنیادی طور پر اس حکم کا مخاطب اہل ایمان کا پورا گروہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ اصول کہ جب تک کسی حکم کے بارے میں یہ صراحت نہ ہو یا کوئی زبردست قرینہ نہ موجود ہو کہ یہ حکم فلاں خاص شخص یا خاص گروہ کے لیے ہے، اس وقت تک اس کو سارے اہل ایمان کے لیے عام سمجھا جائے گا دوسری وجہ یہ کہ اس آیت سے تین آیتیں پہلے جو کچھ فرمایا گیا ہے اسے "**یا ایھا الذین آمنوا** الخ" کہہ کر، یعنی تمام اہل ایمان کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے۔ درمیان کی دو آیتوں میں کفار کے انجام بد کا ذکر ہے اور اس کے بعد ہی یہ آیت سرقہ ارشاد ہوئی ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ **یا ایھا الذین آمنوا** کے خطاب سے جو کچھ یہاں بیان فرمایا گیا ہے، ہاتھ کاٹنے کا یہ حکم بھی اسی کے اندر شامل ہے اور اس کا مخاطب نہ کوئی خاص فرد ہے نہ مسلمانوں کا کوئی خاص گروہ، بلکہ سارے مسلمان ہیں چنانچہ علامہ ابن جریر طبریؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یقول جل ثناء ہ من سرق من رجل او امراۃ فاقطعوا ایھا الناس یدہ.................. فلا تفرطوا ایھا المومنون فی اقامتہ حکمی علی السراق و غیرھم من اہل الجرائم الذین اوجبت علیھم حدودا فی الدنیا

"اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ اے لوگو! جو مرد یا عورت چوری کرے اس کے ہاتھ کاٹ دو.................. اے مسلمانو! چوروں اور ان تمام مجرموں پر، جن کے لیے میں نے دنیا میں سزائیں مقرر کر دی ہیں، میرے احکام جاری کرنے میں ذرا بھی کوتاہی نہ کرنا۔(تفسیر ابن جریر جلد ۲، صفحہ: ۱۳۳)

غور سے دیکھیے ایک جگہ "فاقطعوا" کے مخاطب حقیقی کی تصریح علامہ نے "ایھاالناس" کے لفظ سے کی ہے اور دوسری جگہ "ایھاالمومنون" کے لفظ سے "یااولی الامر" کہیں نہیں فرمایا۔ یہی نہیں بلکہ ساتھ ہی یہ بات بھی واضح کر دی کہ مخاطبت کا یہ عموم صرف اسی آیت سرقہ تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ تمام کے تمام تعزیراتی احکام کا حال یہی ہے اور ان سب میں بنیادی خطاب سارے اہل ایمان کی طرف ہوتا ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ان احکام کے نفاذ کی اصل ذمے داری پوری امت پر ہے، اس لیے یہ عذر کہ چونکہ ان احکام کے مخاطب اولا مر ہیں اس لیے امت کے عام افراد کی ان کے سلسلے میں کوئی مسئولیت ہے ہی نہیں، ایک واہی عذر ہے اور کسی طرح بھی قابل تسلیم نہیں ہے۔

البتہ اس سلسلے میں ایک بات ضرور صحیح ہے، صرف صحیح ہی نہیں بلکہ قطعاً ضروری بھی ہے، اور وہ یہ کہ ان قوانین کا اجراءاولوالامر ہی کے ذریعہ ہو گا کیونکہ نظم مملکت کا تقاضا یہی چاہتا ہے ورنہ معاشرے میں افرتفری پھیل جائے گی اور کوئی اجتماعی نظام باقی ہی نہیں رہ سکے گا۔ حالانکہ اسلام سے بڑھ کر نظم وانضباط کا اور کوئی خواہاں نہیں۔

اب جب کہ دو باتیں اپنی اپنی جگہ ثابت شدہ اور مسلم ہو چکیں۔ ایک تو یہ کہ اجتماعی احکام کی اصل مخاطب اور ذمے داری پوری امت ہے اور دوسری یہ کہ ان کا بالفعل نفاذ اولوالامر کرتے ہیں تو ان دونوں مسلم باتوں کا متفقہ مطلب یہ ہے کہ اولوالامر ان احکام کا اجراء و نفاذ پوری امت کی طرف سے اور اس کی نیابت میں کرتے ہیں۔ نہ کہ اصل مخاطب اور ذمے دار کی حیثیت سے، اس حقیقت واقعی کے پیش نظر ایسی حالت میں، جب کہ یہ نیابت کرنے ولاے کسی وجہ سے موجود نہ ہوں یا موجود ہیں مگر وہ اپنا یہ فرض ادا نہ کر رہے ہوں، اس ذمے داری کا رخ لازماً آپ سے آپ اصل مخاطب، یعنی پوری امت کی طرف ہو جائے گا اور اس کے لیے یہ ضروری ہو جائے گا کہ اگر اولوالامر موجود نہ ہوں تو وہ ان کا تقرر کرے اور اگر موجود ہوتے ہوئے وہ ان احکام کو نافذ نہ کر رہے ہوں تو وہ انہیں اس کے لیے مجبور کرے، یا انہیں ہٹا کر دوسرے لوگوں کو ان کی جگہ پر لائے۔ زیادہ واضح لفظوں میں یوں سمجھیے کہ ان احکام کی نوعیت فرض کفایہ کی سی ہے۔ اگر اولوالامر کے گروہ نے ان کی تعمیل کر دی تو پوری امت کے سر سے یہ فرض اتر جاتا ہے بصورت دیگر یہ ایک اجتماعی گناہ ہو گا جس کا وبال پوری امت پر رہے گا۔

یہاں پہنچ کر ایک اور سوال کیا جائے گا اور وہ یہ کہ ہمارے پاس وہ سیاسی اقتدار کہاں ہے جو ان احکام کے نفاذ کے لیے ضروری ہے اور جس کی موجودگی ہی میں امت اپنے اندر سے اولوالامر کا تقرر کر سکتی اور پھر ان کے ذریعہ اپنے اس فریضے سے عہدہ برآ ہو سکتی ہے؟ یقیناً یہ ایک سنجیدہ سوال ہے اور اس بات سے اختلاف کی گنجائش نہیں کہ ایسے احکام کے نفاذ کی اصل ذمے دار اور مخاطب اگر پوری جماعت ہے مگر عملاً ان کا نفاذ ایک قوت قاہرہ یعنی اقتدار حکومت ہی کی موجودگی میں ہو گا۔ اس اقتدار کے بغیر ان احکام کا جاری کرنا ممکن ہی نہیں۔ اس لیے اس کام کے لیے، یا یوں کہیے کہ قرآن کے ایک بڑے حصے پر عمل کے لیے سیاسی اقتدار کا وجود ضروری ہے لیکن اس سوال کے سلسلے میں سوچنے کی بات کیا ہے؟ آیا یہ کہ سیاسی اقتدار کے نہ ہونے کی صورت میں ہماری اور آپ کی ذمے داریوں میں کمی آجاتی ہے؟ یا یہ کہ وہ اور زیادہ سخت اور گراں ہو جاتی ہیں؟ آیا ہم کو خدا کا شکر ادا کر کے اس بات پر اطمینان کا سانس لینا چاہیے کہ چلو قرآن کے ایک حصے پر تو عمل کرنے سے آزادی ہو گئی؟ یا اس اقتدار کے حاصل کرنے کی سعی کرنی

چاہیے جس کے نہ ہونے کی وجہ سے ہم اپنے پروردگار کے کتنے ہی احکام پر عمل پیرا ہونے کی سعادت سے محروم ہیں؟ نہ صرف یہ کہ سعادت سے محروم ہیں بلکہ اس کی بندگی کا حق ادا کرنے کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہ گئی ہے اور کتاب الٰہی کو چھوڑ بیٹھنے اور بھول جانے کی قدیم سنت ضلال دہرانی پڑ رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اپنے دماغ کو منطقیانہ قیل و قال سے پاک کر کے، کان اپنے قلب و ضمیر کی آواز پر لگا لیجیے اور سنیے کہ وہ ان سوالوں کا کیا جواب دے رہے ہیں؟ یقین جانئے جس قلب میں بھی ایمان کی حرارت موجود ہو گی وہ کبھی سکون اور اطمینان کے ساتھ اس صورت حال کو برداشت کرنے کی اجازت نہ دے گا، اس لیے ان احکام کو نافذ کرنے والی قوت کے موجود ہونے کی شکل میں اگر مت پر صرف ایک فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ان کو نافذ کرائے تو اس کے موجود نہ ہونے کی صورت میں اس پر دو فرض عائد ہو جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ پہلے وہ اس قوت کو حاصل کرے۔ دوسرا یہ کہ قوت حاصل ہو چکنے پر ان احکام کو نافذ کرائے، کیونکہ یہ ایک مانا ہوا اصول ہے کہ جس چیز پر کسی فرض کی ادائیگی موقوف ہوتی ہے اس کا حاصل کرنا خود فرض ہو جاتو ہے۔ آپ اس شخص کو ملامت کرنے میں شاید ایک لمحہ بھی توقف نہ کریں گے جو نماز اس عذر سے نہیں پڑھتا کہ اسے قرآن یاد نہیں یا جانماز ناپاک ہے اور اس پر یہی الزام لگائیں گے کہ یہ اپنے فرض سے جی چرا رہا ہے، اس کے دل میں نماز کی نہ کوئی اہمیت ہے نہ محبت، ورنہ ایسا عذر لنگ نہ کرتا۔ اور دنیا کے سارے کاروبار چھوڑ کر سب سے پہلے قرآن یاد کرنے کی کوشش میں یا جانماز پاک کرنے کی تدبیر میں لگ جاتا۔ پھر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ مسلمان آج قرآنی احکام کے ایک بڑے حصے کو معطل کر کے صرف اس لیے مطمئن بنا بیٹھا ہے کہ ان پر عمل کرنے کے لیے جس اقتدار کی ضرورت ہے وہ میسر نہیں اور اس جھوٹے اطمینان پر اس کی مومنانہ حس کو ذرا ٹھیس نہیں لگتی۔ اور نہ اس کے تقویٰ پر اس کی نگہ احتساب کوئی حرف رکھتی، نہ اسے اپنا یہ عذر، عذر لنگ معلوم ہوتا ہے۔ وہ ذرا نہیں سوچتا کہ اگر یہ اقتدار اسے میسر نہیں تو اس کا اولین فرض ہے کہ اپنی ساری قوتیں اور تدبیریں صرف کر کے اسے حاصل کرے۔

بلاشبہ یہ ایک بڑا دشوار کام ہے اور یہ اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے لیے ساری طاقت نچوڑ نہ دی جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مومن کی طاقت خواہ وہ ذہنی اور دماغی ہو، خواہ جسمانی، مالی ہو خواہ جانی، ہے کس کام کے لیے؟ آخر اس کے دل و دماغ کی قوتیں اور اس کی جان و مال اس کی اپنی ملکیت تو ہیں نہیں کہ انہیں سینت کر رکھے رہے، بلکہ جس روز اس نے ایمان کا اقرار کیا تھا اسی روز یہ چیزیں وہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ، اس کی رضا کے عوض بیچ چکا ہے۔

ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم و اموالھم بان لھم الجنة (توبہ: ۱۱)

"اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔"

اس خرید و فروخت کے ہو جانے کے بعد ان چیزوں کی حیثیت اب اس کے سوا اور کچھ نہیں رہ جاتی کہ وہ اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے امانت کے طور پر رکھی ہوئی ہیں۔ "امانت" کے بارے میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ جب بھی اس کا مالک اسے طلب کرے بے چون وچرا اس کے حوالے کر دینا امانت دار کا فرض ہے، اس لیے جب تک کوئی مومن اپنے مومن ہونے سے انکار نہیں کرتا اس کا یہ فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے رکھی ہوئی اپنی امانت جب اور جس طرح طلب کرے وہ اسی وقت اور اسی طرح اسے لا کر حاضر کر دے، یہ بات کہ یہ اپنی امانت اس نے اپنے مومن بندے کے پاس کس لیے رکھ چھوڑی ہے؟ اس کی کتاب ہی بتا سکتی ہے یہ کتاب کہتی ہے کہ:

جاھدوا باموالکم و انفسکم فی سبیل اللہ (توبہ)

اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔"

بات بالکل واضح ہو گئی، یعنی یہ کہ وہ مقصد، جس میں مومن کی جان ومال خرچ ہونے کے لیے ہے وہ "اللہ کی راہ" دوسرے لفظوں میں اس کا دین ہے اس لیے وہ اپنے فرض بندگی سے سبکدوش اگر وہ سکتا ہے تو صرف اسی شکل میں ان چیزوں کو "اللہ کی راہ" میں نثار کرنے سے دریغ نہ کرے۔ ورنہ جو چیز خدا کی خریدی ہوئی اور ہمارے پاس بطور امانت رکھی ہوئی ہے سے عند المطالبہ اس کی راہ میں خرچ کرنے سے گریز کرنا کوئی معمولی جرم نہ ہو گا، بلکہ بدترین قسم کی خیانت اور کمینہ پن ہو گا کہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ شخص اپنے اوپر اتنا بڑا ظلم کر رہا ہے جس کے پاس خدا نے اپنی چند امانتیں اس لیے رکھ چھوڑی ہیں کہ جب اس کی اطاعت امر کی راہ میں کوئی مانع پیش آئے تو وہ ان کے ذریعے اس مانع کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے۔ لیکن اس کا حال یہ ہو کہ موانع پیش آنے کی صورت میں بجائے اس کے کہ وہ اپنی امانتوں سے کام لے کر انہیں دور کرے، کرتا یہ ہے کہ موانع کا عذر کر کے اس حکم ہی سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے لیتا ہے اور پھر اطمینان کے ساتھ ان امانتوں کو غاصبانہ طور پر اپنی خواہشوں کی چاکری میں لگائے رکھتا ہے۔

اضطرار کا عذر

یہ عذر لنگ تو ان احکام کے سلسلے میں تھا جن پر غیر اسلامی اقتدار بالا کی موجودگی میں عمل فی الواقع نہیں ہو سکتا۔ اب رہ گئے بعض وہ احکام دین جن پر عمل کرنے سے یہ اقتدار کفر بھی مانع نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی انہیں چھوڑ رکھا گیا ہے، تو ان کے سلسلے میں یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ ایسا اضطراراً ہو رہا ہے، اور اضطرار کی حالت میں حرام بھی جائز ہو جاتا ہے غور کیجیے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ عذر ہی جیسا بے وزن عذر ہے اور یہ کہ اس طرح کی بات یا تو اپنی عام اجتماعی ذہنیت کے غلط مطالعے کی بناء پر کہی جا سکتی ہے یا پھر رخصت اضطرار کی ضروری حدود و شرائط سے انتہائی ناواقفیت کی بنا پر۔ چنانچہ آیئے، جس قانون اضطرار کی آڑ لی جاتی ہے، اس کے الفاظ دیکھیے۔

فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیه ان الله غفور رحیم (بقرہ: ۱۷۳)

"البتہ جو شخص مجبور ہو جائے (اور بحالت مجبوری حرام کھا کر اپنی جان بچا لے) اور حال میں کہ (اس حرام شے کے کھانے کی نہ تو وہ کوئی رغبت رکھتا ہو اور نہ ناگزیر مقدار سے) تجاوز کرتا ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ یہ الفاظ ایک حرام شے کے استعمال کی رخصت دیتے ہیں مگر آپ دیکھتے ہیں کہ یہ رخصت بلا قید و شرط نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس کے لیے تین تین شرطیں بھی عائد کرتے ہیں اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان میں سے ایک ایک شرط کا پورا ہونا ضروری قرار دیتے ہیں۔

ان میں سے پہلی شرط تو یہ ہے کہ حالت واقعی مجبوری کی ہو اور کسب حلال کی تمام تدبیریں اس حد تک بے کار ہو چکی ہوں کہ بس لقمہ حرام کے سوا اب جان بچانے کا کوئی ممکن ذریعہ باقی ہی نہ رہ گیا ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ حرام کا یہ استعمال "غیر باغ" ہو یعنی دل میں اس کی کوئی رغبت نہ ہو، بلکہ اس کا استعمال کیا جائے تو پورے احساس ناگواری اور شدید جذبہ کراہت کے ساتھ کیا جائے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ حرام کا یہ استعمال بھی بس اسی حد تک کیا جائے جس حد تک کہ جان بچانے کے لیے ناگزیر ہو۔

اگر ان تینوں شرطوں کے ساتھ کوئی شخص ایک ناجائز شے کا استعمال کرے تو یقیناً اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی کوئی پکڑ نہ ہو گی۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی پوری ہونے سے رہ گئی تو پھر اس رخصت سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا اور اگر اس شکل میں بھی اس سے فائدہ اٹھاتا ہے تو یہ اس کی کھلی ہوئی دھاندلی ہو گی اور اسے اللہ تعالیٰ کے حضور اس کا خمیازہ لازماً بھگتنا پڑے گا۔

اسلامی قانون اضطرار کی وضاحت آپ کے سامنے آچکی۔ اب اس کی روشنی میں اپنے اجتماعی طرزِ عمل کا ٹھیک ٹھیک جائزہ لیجیے اور پھر اپنی ملت کے ان خدا پرستوں کی تعداد بتایئے جو اقتدارِ باطل کے زیرِ سایہ زندگی بسر کرنے "مسرفین" کی اطاعت کرنے، لادین اسمبلیوں میں جا کر قانون ساز بننے، غیر اسلامی عدالتوں میں اپنے معاملات لے جانے اور طاغوتی قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے میں وہی مجبوری، وہی ناگواری اور وہی کراہت محسوس کرتے ہوں جو ایک مومن کی سور کی بوٹی حلق سے نیچے اتارنے میں محسوس ہو سکتی ہے۔ کیا کروڑوں انسانوں کا یہ بھاری انبوہ غیر اللہ کی حاکمیت اور مشرکین کی اطاعت کو حقیقتاً اسی اضطرار کے ساتھ برداشت کر رہا ہے جس کا قرآن میں ذکر ہے؟ کیا مسلمانوں کے یہ گروہ، جو صبح سے شام تک طاغوتی عدالتوں کا طواف کیا کرتے ہیں۔ یہ سب اپنے اس فعل کو اصلاً حرام ہی سمجھتے اور اس کو محض انتہائی مجبوری کے وقت ہی اختیار کرتے ہیں؟ اور ان میں اپنی اغراض نفس کی پیروی حدود اللہ سے بے اعتنائی اور احکام شریعت سے سرتابی کا کوئی داعیہ کار فرما نہیں ہوتا؟ کیا وہاں وہ فی الواقع صرف اس لیے جاتے ہیں کہ انہیں اپنی جان و مال کی حفاظت کا کوئی امکانی راستہ باوجود جستجو کے نہیں ملتا؟ کیا یہ جج اور مجسٹریٹ صاحبان جو اپنی زندگیاں غیر اسلامی آئین و قانون کے مطابق داد انصاف دینے میں گزار دیتے ہیں در حقیقت "مخمصہ" (فقر و فاقہ) ہی کے شکار ہوتے ہیں اور اپنی اسی مجبوری کی بنا پر اپنے مشغلے کو گوارا کرتے ہیں کہ جس وقت وہ اللہ جل مجدہ، کے قوانین پس پشت ڈال کر خدا ناشناسی انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق معاملات کا فیصلہ کرتے ہیں، تو ان کا دل اپنے اس فعل کی برائی کو کوئی احساس رکھتا ہوتا ہے اور اپنی اس حالت پر کڑھ رہا ہوتا ہے؟ کیا وہ یہ کام بالکل **غیر باغ ولا عاد** ہو کر انجام دیتے ہیں؟ اگر ان سوالوں کا جواب نفی میں نہیں ہے تو یقیناً یہ سب لوگ "**فلا اثم علیه**" کی رخصت اور رعایت کے مستحق ہیں۔ کاش ایسا ہی ہوتا۔ مگر خود احتسابی کی جرات سے کام لے کر حقیقت حال کا جائزہ لیجیے تو مشاہدہ آپ کو یہ ماننے پر مجبور کر دے گا کہ ان عدالتوں میں جاتے وقت یا ان کی کرسیوں تک وہ مسلمان پہنچتا ہی کب ہے جو فقر و فاقہ کے ہاتھوں مجبور ہو اور جس کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار رہ ہی نہ گیا ہو کہ بقائے حیات کی خاطر بس یہی رزق خبیث قبول کر لے۔ ان جگہوں تک تو پہنچ ہی وہ لوگ پاتے ہیں جو پہلے ہی سے آسودہ حال ہوتے ہیں۔ یا کم از کم یہ کہ اس انتہائی قسم کے افلاس میں مبتلا نہیں ہوتے جس کو مخمصہ کہا جاسکے۔ اس لیے تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ سب کچھ نہایت ٹھنڈے دل سے اور خوش رغبتی کے ساتھ کیا جا رہا ہے اولاد کی تعلیم دے کر تیار ہی اس لیے کیا جاتا ہے کہ ان کرسیوں تک پہنچ جائیں اور جو پہنچ جاتا ہے وہ ترقی درجات کی کوششوں میں مصروف رہتا ہے حالانکہ اگر واقعتاً اضطراری حالت ہی کی وجہ سے کوئی یہ ذریعہ معاش اختیار کیے ہوتا تو اس کے اطمینان کا فطری تقاضا یہ تھا کہ اس پر ہرگز مطمئن نہ ہوتا۔ اور اسے چھوڑ کر کوئی جائز ذریعہ معاش پا لینے کے لیے بے چین رہتا۔ مگر ایسے لوگ چراغ لے کر ڈھونڈھنے سے بھی شاید نہ مل سکیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کھلی ہوئی طاغوت نوازی کو اضطرار کا نام کس طرح دیا جاسکتا ہے؟ اس طرح اگر فی الحقیقت ہم غیر اللہ کی حاکمیت کے دل سے منکر ہوتے اور ہماری غیرت ایمانی اس سے متنفر ہوتی تو ہم یوں گھروں کے عیش اور مدرسوں کی قیل و قال اور حجروں کے حجروں کے پائے میں سکون کے ساتھ مشغول نہ رہتے، اگر ہم سے کچھ نہ بن پڑتا تو کم سے کم یہ تو کرتے ہی کہ اس "منکر اعظم" کے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہ کرتے اور نہ اس کے سلسلے میں کسی اعتقادی اور قولی مداہنت کے روادار ہوتے۔ اس کے بخلاف ہوتا یہ کہ وہ اپنی زبان کی پوری قوت سے اس کی کھلی مخالفت کرتے اور اگر یہ بھی نہ ہو سکتا تو اس سے دلی نفرت تو بہر حال رکھتے ہی۔ کیونکہ رسول خدا ﷺ کے ارشاد کے مطابق یہ ایمان کی آخری حد ہے آپ ﷺ برائیوں اور برے لوگوں کے سلسلے میں اہل ایمان کا رویہ بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :

من جاهدهم بیده فهو مؤمن، ومن جاهدهم بلسانه فهو مؤمن، و من جاهدهم بقلبه فهو مؤمن لیس وراء ذالك من الایمان حبته خردل

(مسلم۔ جلد اول)

"جس نے ان سے اپنے ہاتھ کے ذریعے جہاد کیا وہ مومن ہے، جس نے اپنی زبان کے ذریعے جہاد کیا وہ (بھی) مومن ہے جس نے اپنے دل کے ذریعہ جہاد کیا وہ (بھی) مومن ہے اس کے بعد رائی برابر بھی ایمان (متصور) نہیں۔"
مگر یہاں حال یہ ہے کہ اتنی بڑی برائی سے کسی نفرت اور کراہت کی ضرورت کا سوال تو الگ رہا۔ اسے برا سمجھنا بھی چھوڑ دیا گیا ہے حتیٰ کہ اس کے قیام کے لیے حلف وفاداری اٹھا لینے میں بھی کوئی مضائقہ باقی نہیں رہ گیا ہے اور اس کی بقا کے لیے علانیہ جسم و دماغ کی ساری قوتیں نثار کی جارہی ہیں۔ کیا ایک قابل نفرت شے سے یہی برتاؤ کیا جانا چاہیے؟ ایسی کھلی ہوئی برائیوں کے بارے میں بھی اگر ایمان کے اس کم سے کم تقاضے کا اظہار نہ ہوسکا جس کی حدیث مذکور میں وضاحت کی گئی ہے تو پھر ایسے ایمان کو زندہ ایمان کیسے کہا جاسکتا ہے؟ آخر اضطرار کی بھی تو کوئی حد ہونی چاہیے۔ اگر اس کے دامن کو اتنی وسعت دے دی جائے، جتنی کہ ہمارے عام رویے سے ظاہر ہورہی ہے تو یقین رکھنا چاہیے کہ دنیا کی کوئی برائی اور قرآن کی کوئی قانون شکنی بھی اس کے دائے سے باہر نہیں رہ سکتی۔ ایسی حالت میں تو ایک "مسلمان" اپنے نفس کی پیروی اسی آزادی سے کرتا رہے گا، جس آزادی سے خدا کے منکر کیا کرتے ہیں اور اخلاق و خدا پرستی کے وہ سارے اصول و ضوابط بے کار رہ جائیں گے جن کی تعلیم کے لیے قرآن کو اتارا اور صاحب قرآن کو بھیجا گیا تھا لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اضطرار کا یہ وہ من مانا مفہوم ہے جس سے اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ بالکل بری ہیں۔

ہم اس پستی تک جس طرح پہنچے ہیں اسے بھی سمجھ لینا چاہیے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب ایک برائی کسی سوسائٹی میں پہلے نمودار ہوتی ہے تو سوسائٹی کا اجتماعی ضمیر اس پر نفرت اور ملامت کا اظہار ضرور کرتا ہے لیکن اس نفرت اور ملامت کا جذبہ قومی اور عام ہوتا ہے تب وہ برائی دب جاتی ہے، ورنہ وہ جڑیں پکڑنے لگتی اور آہستہ آہستہ برگ و بار لانے لگتی ہے اب اگر اس سوائٹی کے خیر پسند لوگ بھی اپنے امکان بھر اس کی جڑیں اکھیڑنے کی کوشش میں برابر لگے نہ رہیں اور اس کے خلاف رسمی اظہار خیال کردینے ہی کو کافی سمجھ لیں تو رفتہ رفتہ ان کے اندر سے بھی اس کی نفرت کا احساس مدھم ہوتا چلا جاتو ہے اور زیادہ دن نہیں گزرنے پاتے کہ وہ برائی برائی نہیں رہ جاتی اور خاص و عام کم و پیش بھی اس کے رنگ میں رنگے نظر آنے لگتے ہیں۔ وہ اس وقت معاشرے کی ایک ضرورت بن جاتی ہے اس پر استحسان یا کم از کم اباحت کا ٹھپہ لگا دیا جاتا ہے اور اس کے اپنی اصولی اخلاقیات تک میں ردو نا گوار نہیں رہ جاتا۔ یہ ایک مسلمہ نفسیاتی حقیقت ہے اور سوسائٹی میں برائیاں کا پھیلاؤ ہمیشہ اسی پرواز پر ہوتا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو جہاں اس بات کی ہدایت کی گئی تھی کہ:

و اللہ لتامرون بالمعروف و لتنھون عن المنکر.................الخ (الحدیث)
بخدا تم معروف کا حکم ضرور ہی کرتے رہنا اور منکر سے ضرور روکتے رہنا...............
وہی اس بات سے باخبر کر دیا گیا تھا کہ:
او لیضربن اللہ بقلوب بعضکم علی بعض (ابوداؤد بحوالہ ریاض الصالحین)
ورنہ اللہ تعالیٰ تم سب کے دلوں کو ایک جیسا (منکر پسند) بنادے گا۔
لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں نے اس ہدایت اور اس تنبیہ کو اپنے دماغوں میں محفوظ رکھا اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ برائیوں میں غرق ہو جانے کے مذکورہ بالا نفسیاتی اصول نے انہیں پوری طرح اپنی زد میں لے لیا۔ جس وقت فکری گمراہی اور عملی خرابیوں نے ان کے اندر گھسنے کی کوشش کی انہوں نے ان کی مسلسل مزاحمت نہیں کی۔ اور آہستہ آہستہ ان سے مانوس ہوتے گئے۔ پھر جب اسی حالت پر صدیاں گزر گئیں تو اب وہ صورت پیدا ہو چکی ہے جس کا ہم مشاہدہ کر رہے ہیں۔ جس کا ہم مشاہدہ کر رہے ہیں۔ یعنی عام مسلمانوں کے دل، ان کے دماغ، ان کی نقطہ ہائے نظر اور ان کے

انداز فکر بھی بدل کر کچھ سے کچھ ہو چکے ہیں۔ جس چیز سے نفرت ہونی چاہیے تھی اس سے رغبت کی جارہی ہے جس چیز سے بھاگنا چاہیے تھا اس کی طلب میں دوڑ لگائی جارہی ہے۔ جس چیز کو پیروں تلے روند ڈالنا چاہیے تھا، وہ دانتوں سے پکڑی جارہی ہے۔ان کے پیغمبر نے انہیں ایمان کی آخری حد یہ بتلائی تھی کہ برائی کوئی بھی ہو اس سے دل میں نفرت رکھی جائے، ایسی نفرت جو اس برائی کو مٹا ڈالنے کے لیے برابر ابھارتی رہے اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ ہی نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ نبی ﷺ نے کسی برائی کا پسند کرنا ہی ایمان کے منافی نہیں قرار دیا تھا۔ بلکہ اسے دیکھ کر اپنے اندر جذبہ نفرت نہ پانے کو بھی ایمانی موت کی یقینی علامت ٹھیرایا تھا۔ مگر اب آپ کے پیروؤں کو اس امر پر اصرار سا ہے کہ ہم کسی کراہت اور احساس نفرت کے بغیر انسانی حاکمیتوں کو سلامیاں دیں گے۔ان کی اطاعتوں کا جو اپنی گردون پر رکھیں گے۔ ان لوگوں سے اپنے معاملات کا فیصلہ کرائیں گے جنہوں نے اپنی "عدالت گاہوں" میں خدا کا "داخلہ" بند کر رکھا ہے بلکہ خود بھی انہی کے بتائے ہوئے قوانین کے مطابق فیصلے کریں گے اور اگر موقع ملا تو خود بھی اپنی حاکمیت کا پھریرا لہرا دیں گے۔ اپنی آزاد مرضی سے قانون سازیاں کریں گے جس چیز کو چاہیں گے جائز اور جس کو چاہیں گے ناجائز ٹھیرائیں گے اور پھر نہ ہمارا دین جائے گا نہ ہمارا ایمان خراب ہوگا۔ نہ ہماری توحید متاثر ہوگی۔ نہ ہماری عبودیت پر حرف آئے گا، نہ ہمارا اتباع رسول ﷺ کا دعویٰ غلط ٹھیرے گا، نہ ہم پر کتاب الٰہی کے چھوڑ بیٹھنے کا الزام عائد ہوگا اور نہ ہم اپنے اللہ سے عہد شکنی کے مجرم ہوں گے کیوں؟ اس لیے کہ ہم حالت اضطرار میں ہیں۔

اسے فریب نظر کہیے یا فریب نفس، بہر حال اس میں ذرا شک نہیں کہ یہ ایک انتہائی مہلک اور خطرناک فریب ہے اس کی خطرناکیوں اور ہلاکتوں کا پورا پورا اندازہ آپ کو اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ اس کے دور رس نتائج کا قدرے تفصیلی جائزہ لے لیں جو ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیوں پر مرتب ہوتے ہیں۔

غیر اللہ کی حاکمیت میں ایک وفادار رعایا بن کر رہنے کے معنی یہی نہیں ہیں کہ ہم نے اسلام کی ایک بنیادی تعلیم کی خلاف ورزی کی۔ بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اب ہماری پوری زندگی، شعوری یا غیر شعوری طور پر ایسے سانچے میں ڈھلتی چلی جائے گی جو اسلام کے مطلوبہ سانچے سے بالکل مختلف ہوگا۔اب ہمارے معاشرے کی تاسیس، ہمارے تمدن کی اٹھان، ہمارے نظام تعلیم کی تربیت اور ہمارے معاشی اور اقتصادی مسائل کی تنظیم ایسی بنیادوں پر ہوگی جو ہماری خواہشوں کے علی الرغم، ہم کو اپنے اجتماعی مسلک اور اپنے تصورات زندگی سے دور پھینکتی چلی جائیں گی۔

غیر الٰہی قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے اور کرانے کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ ایک گناہ سرزد ہو رہا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ ان بہت سے احکام اسلامی کو لپیٹ کر رکھ دیا گیا۔ اور ان کی وقعت دلوں سے محو ہو جانے دی گئی جو ہماری زندگی کے ایک دو نہیں بلکہ بے شمار معاملات سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے دین اور قرآن کو سمٹ کر مسجدوں اور حجروں میں بند کر دیا اور اس کے صرف اتنے حصے پر اکتفا کر لیا جس کا تعلق بس چند مذہبی رسوم اور عبادات سے ہے۔

یہ محض عالم قیاس کی باتیں نہیں ہیں بلکہ واقعات اور حقائق ہیں جنہیں ہر وہ شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے جس نے اپنے دینی احساس کو کند نہ بنا لیا ہو۔ ملت کے علم برداروں نے قرآن کے ایک حصے کو قتدار کے حاصل نہ ہونے کا عذر کر کے اور اولوالامر کو اس کا بنیادی مخاطب قرار دے کر، اور پھر اضطرار کی آڑ لے کر زمانہ سازی کی جو روش اختیار کی تھی اس کا نتیجہ نہ نکلا ہے کہ قرآن کے کتنے ہی احکام اور اصول سے ان کا علمی رشتہ کٹ کر رہ گیا ہے اور دین کے ان بنیادی اصولوں اور اس کے ان اہم تقاضوں سے اس جبری علیحدگی پر ایمانی خودی مضطرب تو ضرور ہوئی، مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ اضطراب سکون واطمینان سے بدلتا گیا اور اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ دین صرف انہی چند عبادات اور مذہبی رسوم تک محدود ہو کر رہ گیا ہے جن کو لوگ عموماً ادا کر لیا کرتے ہیں اور ان کے علاوہ جو کچھ ہے دین سے اس کا تعلق، غیر محسوس طور پر، بس برائے بیت ہی خیال کر لیا گیا

ہے۔ اگر فکر و نظر کے زاویے ایسے نہ بن گئے ہوتے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ان اجزائے دین پر اگر عمل نہیں ہو رہا تھا تو اسی کے ساتھ ان کی نظری اہمیت بھی گھٹ جاتی؟ اور اس حد تک گھٹ جاتی کہ دل ان کے لیے اضطراب، کسی تمنا، اور کسی حسرت سے بھی محروم ہو جاتے؟ ہم تو دیکھتے ہیں کہ مسجد کی ایک اینٹ بھی اگر کھود کر پھینک دی جائے تو اس گئی گزری حالت میں بھی مسلمانوں کی گردنیں خون کے دریا بہانے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ مگر اللہ کے بے شمار احکام کی مظلومیت پر بہانے کے لیے ان کے پاس چند قطرے آنسو بھی نہیں ہوتے۔ اس فرق کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ تو دین کا کام سمجھا جاتا ہے اور یہ کچھ دنیا کا۔ لیکن چونکہ یہ احکام بھی اسی قرآن میں موجود ہیں، جس میں ان چند مخصوص عبادات اور رسوم کا ذکر ہے اور ہر حکم کی اتباع کا قول دیا گیا ہے جو قرآن و سنت میں ہو۔ اس لیے زبان سے یہ کہنے کی جرات تو نہیں ہوتی کہ یہ احکام دین سے غیر متعلق ہیں مگر جب ان پر عمل کرنے اور ان کے سلسلے میں دیئے ہوئے قول کو پورا کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو غیر شعوری طور پر دین کا وہی محدود تصور اور سہل پسندی کا مخفی جذبہ کبھی ان احکام کا اصل مخاطب بننے ہی سے انکار کرا دیتا ہے اور کبھی رخصت اضطرار کی ڈھال ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔

غرض حقیقت حال اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ غیرت ایمانی کی کمی، احساس فرض کی پژمردگی اور سہل پسندی کے غلبے نے کافرانہ اقتدار اور باطل اصول و نظریات کے سامنے سپر ڈالنے پر آمادہ کیا۔ پھر اس آمادی نے قرآن کے ایک بڑے حصے کو عمل و اتباع کی حدود سے خارج کر دینے پر مجبور کر دیا۔ بعد ازاں اس مجبوری نے خدا پرستی کا بھرم رکھنے اور اپنی نگاہوں سے آپ اپنی خطاکار صورت چھپائے رکھنے کے لیے دین کے تصور ہی کو محدود اور بے روح بنا کر رکھ دیا۔ ایسا محدود کہ جن احکام پر عمل نہیں ہو رہا ہے نظری طور پر بھی وہ ہماری آزادروی پر کبھی انگلی تک نہ اٹھا سکے۔ پھر اس محدود اور بے روح تصور دین نے ملت کی اس عظیم معصیت اور بے عملی کے اس احساس کو بھی سلا دیا۔ سب سے آخر میں سیاسی اقتدار سے محرومی اور اضطرار کے حیلے آئے، اور انہوں نے آکر ان تمام رخنوں کو ڈھک لیا جو ہزار کوششوں کے باوجود ان نظریات کے اندر دکھائی پڑ ہی جاتے تھے۔ اور اب یہ تمام چیزیں ایک دوسرے سے غذا حاصل کر رہی ہیں اور سب نے مل کر مغالطوں اور خوش فہمیوں کا ایسا جال تیار کر دیا ہے جس کے اندر غور و فکر کی قوتیں صید زبوں بن کر رہ گئی ہیں۔ نتیجہ اس پوری صورت حال کا یہ ہے کہ مسلمان پر حقیقت بینی کی راہ بند سی ہو گئی ہے اور اس میں تلاش منزل کی امنگیں بھی دم توڑتی جا رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب سے بڑی بدقسمتی ہے جس میں کوئی مسلمان مبتلا ہو سکتا ہے۔ اگر ایک شخص میں اپنی غلطی کا احساس زندہ ہو تب تو یہ امید ضرور کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن اس کی اصلاح کرے گا لیکن اگر یہ احساس ہی مردہ ہو گیا۔ اور اس کی نظر میں غلطی غلطی ہی نہ رہ گئی تو پھر اس کے اصلاح پذیر ہونے کی کوئی توقع باقی نہیں رہ جاتی۔ اس لیے اگر اس ملت نے اپنی کامل تباہی اور دین و دنیا دونوں کی رسوائی کا تہیہ نہ کر لیا ہو تو اسے چاہیے کہ اپنی بے گناہی کے زعم باطل سے جلد از جلد باز آجائے اور اتباع دین کے معاملے میں جو کوتاہیاں اس سے سرزد ہوتی چلی آ رہی ہیں ان کو سیدھی طرح تسلیم کر کے اس کی تلافی کی کوشش کرے۔

نگاہ مسلم کی بے بصیرتی

اللہ تعالیٰ کی ہدایت بخشی کا معاملہ بھی عجیب شان رکھتا ہے۔ ایک ہی چیز ہوتی ہے جس سے کسی کے سامنے ہدایت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور وہ حقیقت کو پا لیتا ہے۔ مگر وہی چیز دوسروں کے لیے ضلالت کا پیام بن جاتی ہے۔ اور وہ اس کے باعث راہ راست سے اور دور ہو جاتے ہیں۔ اس معاملے کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے اس قانون عدل پر ہے کہ جو حق کی سچی طلب رکھتا ہے اس کے سامنے اس کی راہ کھولی جاتی ہے اور جو حق سے بے اعتنائی برتتا ہے اس کے سامنے اس کی تجلی کبھی نہیں چمکتی۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ سورج کی کرنیں بینائی والوں کے لیے پوری دنیا کو روشن کر دیتی ہیں۔ مگر الوؤں اور چمگادڑوں کی نگاہیں اپنے جبلی نقص کی بنا پر ان کے فیضان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا پائیں۔ چنانچہ قرآن نے اپنی صفت جہاں یہ بتائی ہے کہ میں لوگوں کے لیے مشعل ہدایت ہوں، وہی یہ بھی کہا ہے کہ بہتوں کے لیے گمراہی کا ذریعہ بھی ہوں۔ (یضل بہ کثیراً و یھدی بہ کثیراً۔

بقرہ)اس کے اس قول میں اسی قانون ہدایت کی طرف اشارہ ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ راہ راست اسی شخص کو دکھاتا ہے جو دیکھنا چاہے اور اسی وقت دکھاتا ہے جب دیکھنے کی اسے حقیقی آرزو ہو۔ لیکن جو اپنی آنکھیں بند ہی رکھتا ہے۔ اسے زبردستی دھکیل کر اس راہ پر ڈال نہیں دیا جاتا۔ بلکہ اس کے برعکس ہوتا ہے، کہ اس بے اعتنائی کے رد عمل میں وہ اس سے کچھ اور دور جا پڑتا ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ قانون صرف کفار ہی کے لیے ہے، اور مومن چونکہ اس پر ایمان لا چکے ہیں اس لیے اب وہ قانون کے دائرہ نفاذ سے باہر ہیں۔ نہیں، بلکہ یہ کافر اور مومن سب کے لیے عام ہے، ایک مومن بھی قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود زندگی کے مختلف معاملات میں اس سے کسب ہدایت اسی وقت کر سکتا ہے جب وہ پورے اخلاص کے ساتھ اس کی خواہش اور کوشش بھی کرے۔ ورنہ جس وقت بھی اور زندگی کے جن معاملات میں بھی، اس نے اس سے رہنمائی کی خواہش نہ کی، اور غیر مشروط طور پر اس کی پیروی کرنے کی اور اس غرض سے اس کا زاویہ نگاہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی، تو یقیناً وہ اس کی گمراہیوں کی تاریکیوں میں بھٹکتا چھوڑ دے گا اور اس بات کا لحاظ نہ کرے گا کہ وہ میرا منکر نہیں، بلکہ میرا ماننے والا ہے یہی وجہ ہے کہ مومن کو اس امر کی تلقین کی گئی ہے کہ ایمان لانے اور ہدایت پا لینے کے بعد بھی اپنے قلب و نظر کو کجروی سے مامون نہ سمجھے، اور ہر وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے کہ خدایا! میرے سامنے سے ہدایت کی روشنی گل نہ ہونے پائے۔ ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا (آل عمران:۸)

قرآن کے ان احکام کے بارے میں جو اس وقت زیر بحث ہیں دراصل یہی قانون ہدایت کام کر رہا ہے چونکہ ان کے سلسلے میں امر حق معلوم کرنے کی سچی خواہش باقی نہیں رہی اس لیے نتیجہ اس کے بغیر اور کیا نکل سکتا تھا کہ جہاں سے سمت منزل کی رہنمائی ہو رہی تھی ٹھیک اسی جگہ سے بھٹکنے کا سامان فراہم کر لیا گیا۔ قرآن و سنت میں جو اس انداز خطاب کے ساتھ احکام آتے ہیں کہ اے مومنو! ایک خدا کی فرمانروائی کے آگے خود جھکو اور سارے عالم کو اس راہ راست کی طرف بلاتے رہو، اے ایمان رکھنے والو! کفر کے علمبرداروں سے لڑ کر فتنہ وفساد کا سر کچل دو، اے اہل ایمان! زانی کو درے لگاؤ، وغیر ذالك.................... تو اس انداز خطاب کی اصل بنیاد ایک ایسی عظیم الشان حقیقت پر تھی کہ اس کا صحیح تصور ہی اس کار گہ حیات میں مومن کا مقام متعین کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اگر ہم امر حق کی سچی طلب لے کر قرآن پر نگاہ ڈالتے تو پاتے کہ یہ طرزِ خطاب اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں اس امت کی حیثیت ایک صاحب اقتدار پارٹی سے کم کی ہے ہی نہیں، وہ اس کا مقام رہبانیت کے حجروں میں یا محکومی کے جوتے تلے نہیں، بلکہ امامت جہانبانی کے تخت پر بتا رہا ہے اور اس مقام سے نیچے وہ اس کی حیثیت کو فرض ہی نہیں کرتا، نہ اس سے نیچی سطح پر وہ کبھی اسے دیکھنا چاہتا ہے۔ سوچئے تو سہی، ملی زندگی کا کتنا بلند تصور تھا۔ جو اس اسلوب بیان کے پیچھے موجود ہے۔ اور قلب مسلم کو کیسے پاکیزہ اور عالی عزائم سے معمور کر دینے والا پیام تھا جو یہ اشارہ قرآنی دے رہا ہے؟ مگر تصور نظر کا برا ہو، اس چشمہ حیوان کو بھی ہم نے اپنے لیے بحر ہلاکت بنا لیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اللہ رب العزت کے اس طرز خطاب کی حکمت کو سمجھ کر اپنا کھویا ہوا مقام اور بھولا ہوا فریضہ یاد کر لیا جاتا، اپنی کوتاہیوں پر نادم ہو کر ان کی تلافی کی کوشش کی جاتی اور پھر اس مقام کی بازیافت کی سرفروشانہ جدوجہد میں لگ جایا جاتا۔ جہاں ہمارا آقا ہم کو دیکھنا چاہتا ہے اور جہاں پہنچے بغیر ہم اس کے بہت سے احکام کی تعمیل اور اس کی پوری رضامندی کی تحصیل کر ہی نہیں سکتے۔ مگر افسوس کہ یہ کچھ بھی نہ ہوا۔ بلکہ یہ کہہ کر ان احکام کے مخاطب تو احکام اور اولوالامر ہیں۔ ہم نے اپنی ذمے داری کا بوجھ ہی اتار کر پھینک دیا۔

بالکل اسی انداز سے آیت اضطرار پر بھی نظر ڈالی گئی۔ غیر باغ ولا عاد کی شرطوں میں غیرت حق کے تحفظ کا جو راز چھپا ہوا تھا، اور ناموافق سے ناموافق مواقع میں بھی اپنے ایمانی ذوق کی بلندی برقرار رکھنے کا ان میں جو مطالبہ موجود تھا اس کی طرف نظریں گئی ہی نہیں یا گئی ہوئی نظریں پھیر لی گئیں اور فلا اثم علیہ پر انہیں لا کر اس طرح جما دیا گیا کہ پھر دین کی پیروی میں نہ کسی قربانی کا سوال باقی رہ گیا نہ وہ نفس پر کچھ ایسی گراں رہ گئی۔ بلا شبہ اس آیت میں بحالت میں بحالت مجبوری حرام سے استفادے کی رخصت عطا کی گئی ہے لیکن یہ آیت کا صرف ایک پہلو ہے اور اس کا ایک پہلو اور بھی ہے ضروری ہے کہ وہ بھی نگاہ میں رہے، آیت کے اس دوسرے پہلو کی ترجمانی غیر باغ ولا عاد کے الفاظ کرتے ہیں ان لفظوں میں حرام سے استفادہ

پر جو شرطیں لگائی گئی ہین ان کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ مسلمان اگر کسی حرام سے استفادہ کرنے پر مجبور ہو جائے تو چاہیے کہ اسے استعمال کرتے وقت اپنے اندر اس کی کوئی رغبت محسوس نہ کرے نہ بالکل ناگزیر مقدار سے زیادہ اسے استعمال کرے بلکہ ان کا مطلب یہ بھی ہے کہ اس حالت سے نکلنے اور اس استعمال حرام سے نجات پاجانے کی اسے گہری فکر اور بے تابانہ کوشش کرنی چاہیے، بالکل اسی طرح کہ کسی شخص کا پاؤں اگر نکیلے اور تپتے ہوئے سنگریزوں پر پڑ جاتا ہے تو وہ تلملا کر اسے جلد از جلد اٹھا لینا چاہتا ہے جب تک اس حالت سے نجات نہ مل سکے بس یوں سمجھتا رہے کہ مردار کا سڑا گوشت ہے جس کو دانتوں سے نوچ رہا ہوں۔ یا خنزیر کی بوٹیاں ہیں جن کو نگل رہا ہوں، یا سڑاند بھری غلاظت ہے جس سے جسم اور کپڑے لت پت ہو گئے ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آیت کا یہ پہلو بھی اگر ہماری نظروں میں ہوتا اور اس کے بتائے ہوئے اس ایمانی ذوق کے اگر ہم قدر شناس ہوتے تو اس وقت ہماری دنیا یہ دنیا نہ ہوتی اور وہ شکست خوردہ ذہنیت، وہ پست نگاہ اور وہ ایمان سوز طرز فکر ہماری قوتوں کو اس طرح مفلوج نہ کر دیتا اور کروڑوں انسانوں کو اتنی بھاری جمعیت اضطرار کے نام پر صدیوں تک باطل کے ساتھ اس طرح کی قابل شرم سازگاری نہ دکھاتی کہ اتباع قرآن کے دعویٰ رکھنے کے باوجود اس کا ضمیر کبھی اسے جھٹکا دیتا ہے نہ اس کی ایمانی غیرت کبھی اس کا دامن پکڑتی ہے اس کے بخلاف ہوتا یہ کہ باطل افکار، غلط نظریات اور غیر اسلامی نظام ہائے حیات کے خلاف ہم مجسم احتجاج ہوتے۔ ہمارا ایمانی مزاج ہماری زندگی کو تلخ بنا دیتا اور ہماری اسلامی حس ہمیں مجبور کر دیتی کہ اس گندگی کو جس طرح بھی ہو سکے اپنے دامن سے دھو کر دم لیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ہم کو اضطرار کی رخصت تو یاد رہ گئی مگر غیر باغ ولا عاد" کی شرطیں اور ان شرطوں کے تقاضے سب فراموش ہو گئے۔

امید ہے ان بحثوں کے بعد یہ اب کوئی مشکوک حقیقت نہ رہ گئی ہو گی کہ دین کے جزوی اتباع پر مطمئن رہنا اور اسے اپنے ایمانی فرائض سے عہدہ برآ ہو سکنے کے لیے کافی سمجھ بیٹھنا کسی طرح صحیح نہیں۔ یہ ایک ایسی غلط فہمی، بلکہ نافہمی ہے جسے افسوس ناک بھی کہنا چاہیے اور خطرناک بھی۔ ایسا سمجھنا دراصل ایمان کے بے جان ہونے کی دلیل ہے یا پھر دین کی بصیرت سے محروم ہو جانے کا ثبوت، یہ فریب نفس کا ایسا خطرناک طلسم ہے جو اگر پوری قوت سے نہ توڑا گیا تو قلب ملت کی وہ کمزور دھڑکنیں بھی ختم ہو جائیں گی جو ابھی تک کبھی کبھی محسوس ہو جایا کرتی ہیں۔

۲۔ ناسازگار حالات کا عذر

اب اس گروہ کے خیالات کو لیجیے جو اس نصب العین اور واحد فریضہ حیات کی بجاآوری سے اس لیے کترا رہا ہے، اور دوسروں کو بھی کترا کر چلنے کا مشورہ دے رہا ہے کہ موجودہ حالات اس کام کے لیے کسی طرح سازگار نہیں اور ان کے اندر اس کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ پھر حالات کے اس مطالعہ کا تقاضا وہ یہ بتاتا ہے کہ فی الحال اس کام کا نام بھی نہ لیا جائے اور اس کے بجائے اپنی ساری قوتیں کسی ایسے مورچہ پر سمیٹ دی جائیں جہاں سے ہم حالات کی رفتار پر اس طرح اثر انداز ہو سکیں کہ مستقبل کی فضا اس کام کے لیے اتنی تاریک نہ رہ جائے۔ یہاں تک کہ ایک وقت چل کر ہم اپنی اس حقیقی منزل مقصود کی طرف علانیہ مارچ کر سکیں۔

چند تنقیحی سوالات

اس نظریے پر غور کیجیے تو قدرتاً ذہن میں یہ چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:۔

ا۔ کیا اس فریضے کی ادائیگی کے لیے براہ راست جدوجہد کرنے میں حالات کی ناسازگاری اور اس جدوجہد کے امکان وعدم امکان کی بحث پیدا بھی ہو سکتی ہے؟

۲۔ کیاآج کے حالات میں دین کی اقامت واقعی ناممکن ہے؟
۳۔ ناسازگاری حالات کی بناپراس منزل کی طرف پھیر کے راستوں سے پیش قدمی کرنے کی کوئی عملی مثال،کوئی انسانی تجربہ،یاکوئی صحیح فکری بنیاد موجود ہے؟
ان سوالوں کا صحیح جواب جب تک معلوم نہ ہو جائے اس نظریۓ کا حق یاناحق ہونا بھی معلوم نہیں ہو سکتا۔اس لیے ضروری ہے کہ اللہ کی کتاب اور اس کے پیغمبروں کے طریق کاراوراسوہ اعمال سے ان کے واضح جوابات حاصل کیے جائیں۔
اللہ کی کتاب سے،اس لیے کہ اسی نے اپنے پیروؤں پر یہ بار عظیم ڈالا ہے،اور ساتھ ہی اس کا یہ دعویٰ ہے،جس کی صداقت کا کوئی مسلمان انکار نہیں کر سکتاکہ وہ تبیاناًلکل شیءٍ ہے اس لیے یہ ممکن نہیں کہ دوسرے تمام امور میں تو اس نے ہماری رہنمائی کی ہواور اسی مسئلے کو تاریکی میں چھوڑ دیا ہو جو سارے مسائل سے زیادہ اہم تھااور جو تمام فرائض دینی کا صدر نشین ہے۔
اللہ کے رسولوں کا طریق کار اور اسوااعمال سے،اس لیے ان کو پاکان خاص اور ان کے سچے پیروؤں کے سوا دنیا کسی ایسے انسان یاانسانی گروہ سے واقف ہی نہیں جس نے اس نصب العین کواپنایاہو۔

امکان کی بحث سے ادائے فرض کی بے نیازی

پہلے سوال کا جواب اللہ کی کتاب یہ دیتی ہے کہ مومن کے لیے اپنے اصل فریضے اور مقصد وجود کی خاطر جدوجہد ہر حال میں ضروری ہے اور اسے چاہیے کہ انجام کی پرواکیے بغیر اس میں ہر وقت لگارہے۔اسی طرح انبیائے کرام کااسوہ بھی ٹھیک اسی بات کی گواہی دیتا ہے۔چنانچہ قرآن کاارشاد ہے کہ جو نبی بھی دنیامیں آیااسے لوگوں کے سامنے آتے ہی یہ مطالبہ رکھ دینے کا حکم تھاکہ :

ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت(نحل:۳۶)

"لوگو!اللہ کی بندگی کرواور طاغوت کی پیروی سے بچو۔"

..............انہ لا الہ الا انا فاعبدون(انبیاء:۳۵)

"..............بلاشبہ میرے سوا کوئی معبود نہیں لہذامیری بندگی کرو۔"

یہ چند حرفی مطالبہ دراصل اسی انقلابی مشن کاایک اجمالی تعارف ہے جس کو اقامت دین کہتے ہیں۔بہت ممکن ہے کہ اس وقت "عبادت" اور "طاغوت" کے جن محدود مفہوموں سے عام ذہن آشنا ہیں ان کی بناپر اس بات میں کچھ غلو محسوس ہو،لیکن قرآن مجید نے شرع لکم من الدین ما وصّٰی بہ نوحاً ، ان اقیموا الدین فرماکراس خیال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دی ہے کیونکہ اس کے ان لفظوں سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہورہی ہے کہ نوحؑ ہوں یاابراہیمؑ،موسیٰؑ ہوں یاعیسیٰؑ،محمد ﷺ ہوں یاکوئی اور پیغمبر بلااستثناء ہر نبی کواللہ کے نازل کیے ہوئے دین کی دعوت و اقامت ہی کافریضہ سونپا گیا تھا۔اس لیے فاعبدوا اللہ کاپورااور صحیح مفہوم اس مفہوم کے سوااور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔جو اقیموا الدین کا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ ان حضرات نے اپنے اس فریضے کو کس طرح ادا کیا؟ تو اس کے جواب میں کیا یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ جس مشن اور مقصد کو لے کر یہ اصحاب عزیمت تشریف لاتے رہے ہیں اس کے اظہار و اعلان میں، یا اس کی جدوجہد میں انہوں نے ایک لمحہ کی بھی دیر لگائی ہو گی؟ یا یہ کہ حالات کی سازگاریوں کا جائزہ لیا گیا ہو یا یہ کہ امکان و عدم امکان کی بحثوں میں الجھے ہوں گے۔ اور جب اس جائزے اور بحث سے کامیابی کے روشن امکانات سامنے آگئے ہوں گے تب جا کر انہوں نے اپنی کشتیوں میں بادباں لگائے ہوں گے؟ ہو سکتا ہے کہ عقل مصلحت اندیش کا فتویٰ اس بارے میں کچھ اور ہو، مگر قرآن کا کہنا تو یہی ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔ اس کے بخلاف ہر نبی نے اپنے اس فرض منصبی کی ادائیگی اس شان سے کی کہ نہ تو کبھی اس مہم کے کامیاب ہو جانے کی اس نے خدا سے گارنٹی طلب کی، نہ ایک لمحہ اس کا انجام سوچنے میں ضائع کیا، نہ اس کے امکان و عدم امکان کا اس کے ذہن نے سوال اٹھایا، نہ حالات کی کوئی ناسازگاری ایک دن کے لیے اس سے اس آواز کو سینے میں دبا رکھنے کا مطالبہ کر سکی۔ بلکہ وہ اپنی بعثت کی ابتداء سے زندگی کے آخری لمحے تک اپنے اس فرض کو مسلسل بجالاتا رہا۔ ان میں اگر کچھ ایسے تھے کہ ان کی دعوت الی الحق کامیاب ہو گئی اور وہ دنیا چھوڑنے سے پہلے سچے خدا پرستوں کا ایک گروہ پیدا کر کے دین اللہ کو غالب اور نافذ فرما گئے تو بے شمار ایسے بھی تھے جن کی آواز آخر تک بے حس دلوں کی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس ہوتی رہی، نوح علیہ السلام نے تقریباً ایک ہزار سال کے لیل و نہار، اس ادائے فرض میں صرف کر ڈالے۔ مگر اس طویل اور صبر آزما جدوجہد کا انجام زیادہ تر صرف ان گالیوں اور پتھروں کی شکل میں نمودار ہوتا رہا جن سے ان کی "قوم" رات دن انہیں نوازتی رہتی تھی اور جب وہ اپنا فرض بجالا کر دنیا سے رخصت ہونے لگے تو ان کی دعوت قبول کرنے والوں کی تعداد گنتی کے چند افراد سے زیادہ نہ تھی۔ ابراہیم علیہ السلام بڑھاپے کی عمر تک بندگی رب کا پیغام سناتے پھرے اور اللہ کے دین کو قائم کرنے کی لگاتار کوششیں کرتے رہے۔ اس کوشش اور پیغام رسانی میں انہیں جیسی جیسی ابتلاؤں اور مصیبتوں سے گزرنا پڑا وہ شاید ہی اپنا نظیر رکھتی ہوں گی لیکن اس ساری تگ و دو اور پیہم قربانیوں کا ظاہر میں جو ثمرہ نکلا وہ یہ تھا کہ ان کے اپنے اہل و عیال اور بعض قریبی اعزہ کے سوا مشکل ہی سے کوئی ان کی آواز پر لبیک کہنے والا تھا۔ حضرت لوطؑ، شعیبؑ، ہودؑ، صالحؑ، اور عیسیٰؑ، جیسے حضرات بھی موجود ہیں، جن کی تبلیغ و ہدایت کا انجام یہ ہوا کہ حق کا فدائی تو انہیں ایک نہ ملا، لیکن ان میں سے کسی کی گردن اڑا دی گئی اور کسی کے سر پر آرے چلا دیئے گئے۔ ویقتلون النبیین بغیر حق (آل عمران: ۲۱)

اور قریب آکر دیکھیے، خاتم النبیین ﷺ کا طرز عمل اس واقعیت کا سب سے واضح اور مفصل ثبوت ہے ہر شخص جانتا ہے کہ آپ ﷺ کی پیغمبرانہ ذمے داریاں ہر نبی سے زیادہ تھیں۔ کیونکہ آپ ﷺ کو جو دین قائم کرنے کے لیے دیا گیا تھا، وہ جامع ترین دین تھا۔ دوسری طرف اس دین کا مخاطب کسی ایک مخصوص قوم اور ملک کے بجائے پورا عالم انسانی تھا، اور اس عالم انسانی کا یہ حال تھا کہ اس کے ایک ایک گوشے میں طاغوت کا علم گڑا ہوا اور کفر و شرک کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود آپ ﷺ جب منصب نبوت پر سرفراز ہوتے ہیں تو حکم ہوتا ہے کہ:

فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشرکین (حجر: ۹۴)

"جس تعلیم کا تمہیں حکم دیا گیا ہے اسے واشگاف پہنچا دو۔"

آپ اس حکم کی تعمیل میں جیسا کہ چاہیے تھا، کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اپنی دعوت لوگوں کے سامنے رکھ دیتے ہیں اور اسے فطری رفتار سے وسعت دیتے جاتے ہیں۔ چند سال بھی نہیں گزرنے پاتے کہ یہ پکار گھروں، گلیوں، مجلسوں اور قرابتی حلقوں سے آگے بڑھ کر پہاڑ کی چوٹیوں سے بلند ہونے لگتی ہے، سننے والوں نے جس طرح اس پکار کا جواب دیا اس کو مکہ اور طائف کی گلیاں قیامت تک نہ بھولیں گی۔ لیکن خدا کے فرض شناس بندے کو ان باتوں کی ذرا بھی پروا نہیں ہوتی۔ اس کو اگر پروا ہوتی ہے تو صرف اس بات کی کہ جس کلمہ حق کو پہنچانے کا فریضہ مجھ پر عائد کیا گیا ہے اس کو پہنچا دینے میں کوئی کسر نہ رہ جائے یا پھر اس بات کی کہ بھٹکتی ہوئی انسانیت کی نجات اور بہبود جس صداقت پر منحصر ہے اس کو یہ

سنتی اور مانتی کیوں نہیں؟اس کی ساری تمنائیں بس اسی ایک تمنا میں آکر سمٹ گئی ہیں کہ کسی طرح میری بات دلوں میں اتر جائے اور جس دین کو اللہ نے میرے ذریعے نازل فرمایا ہے اس کے بندے اپنے کو اس کے حوالے کر دیں مگر اللہ تعالیٰ ہے کہ اس کو بار بار اور محبت کے ساتھ جھڑکتا ہے اور یہ حقیقت ذہن نشین کراتا ہے کہ تمہارا کام امر حق کو صرف پہنچادینا اور کھول کھول کر بیان کر دینا ہے اس کے بعد اگر ایک شخص بھی اسے سن کر نہیں دیتا تو اس کی پروانہ کرو(فان تولوا فانما علیك البلاغ المبین)اس لیے تم اپنی دعوت کا کام انجام سے بالکل بے پرواہو کر بجالاتے رہو، یہ نہ سوچو کہ کیا ہوگا؟ ہو سکتا ہے کہ تم اپنی ہی آنکھوں سے اس دعوت کو کامیاب اور اس کے دشمنوں کو تباہ و برباد دیکھ لو، اور اس کا بھی امکان ہے کہ ایسا نہ ہو:

و اما نرینك بعض الذی نعدھم او نتوفینك فالینا مرجعھم ثم اللہ شھید علی ما یفعلون(یونس:۴۶)

(اور تمہاری نگاہوں کے سامنے ہی اپنے انجام بد سے کسی قدر دوچار ہو لیں گے) یا (اس کے قبل ہی) ہم تم کو وفات دے دیں گے۔ کیونکہ ہماری ہی طرف تو ان کو پلٹ کر آنا ہے پھر یہ کہ ان کے سارے اعمال خدا کی نگاہ میں ہیں۔

یہ تاریخ انبیاء کے چند مشہور و معروف ابواب ہیں جو سوجھ بوجھ رکھنے والوں کی ہدایت اور سبق آموزی کے لیے قرآن حکیم میں بیان کیے گئے ہیں ان سرگزشتوں میں اتباع حق کا جو اصول سب سے زیادہ، اور جو نقش حقیقت میں سب سے زیادہ ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے وہ یہی ہے کہ اللہ کے دین کی اقامت کے لیے کوئی شگون لینے کی ضرورت نہیں۔ نہ حالات کی ناسازگاریوں کا اندازہ لگانے کی کوئی گنجائش ہے اور نہ کامیابی کے امکانات ٹٹولنے کا کسی کو حق ہے۔ جو چیز ہمارا فریضۂ زندگی قرار پاچکی وہ ہر حیثیت سے اس بات کی مستحق ہے کہ جب تک زندگی ہے اس کے لیے پوری پوری جدوجہد کرتے رہیے۔ وہ فرض دراصل دل سے فرض مانا ہی نہیں گیا جس کو مشکلات کے اندیشے سرد خانے میں ڈلوادیں اور جو امکان وعدم امکان کی بحثوں کا زخم کھا سکے۔ اگر دعوت توحید اور اقامت دین کا کام شروع کرنے سے پہلے امکانات کا جائزہ لینا صحیح ہوتا تو یقین جانئے کہ انبیاء کی ایک بڑی تعداد اپنے مشن کا نام بھی زبان پر نہ لاتی۔ اس کے لیے عملی جدوجہد کا تو کیا سوال پیدا ہوتا؟ کیونکہ انبیاء علیہم السلام اقامت دین کا مشن لے کر دنیا میں عموماً بھیجے ہی اس وقت جاتے تھے جب اس کام کے لیے حالات کی ناسازگاریاں اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہوتی تھیں۔ اور جب کلمۂ حق کا نشوونما بظاہر ناممکن سے ناممکن تو ہو چکا ہوتا تھا۔ لیکن حالات کی ان شدید ناسازگاریوں اور امکان کامیابی کی بظاہر ان انتہائی کم یابیوں کے باوجود جن سے ہم اپنے زمانے کی ناسازگاریوں اور دقتوں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں کر سکتے۔ انہوں نے بلا توقف کشتی سمندر میں ڈال دی، اور ذرا نہ سوچا کہ ساحل کہاں اور کدھر ہے؟ موسم پر سکون ہے یا طوفانی؟ ہوا موافق ہے یا مخالف؟ کشتی کھیلنے والے بازوؤں میں توانائی کتنی ہے؟ سمندر پیدا کنار ہے یا ناپیدا کنار؟ راستہ صاف ہے یا پانی کے اندر چٹانیں ہیں؟ اس طرح کا کوئی ایک بھی سوال نہ تھا، جس نے ان کے ذہنوں میں کبھی بار پایا ہو۔

پھر اب وہ کن لوگوں کا اسوہ ہے جو اس معاملہ میں ہماری رہنمائی کا حق رکھتا ہے؟ اور جس کی سند پر ہم مشکلوں اور ناسازگاریوں کے پیش نظر اپنے مقصد وجود سے عارضی طور پر بھی "تائب" ہو جا سکتے ہیں؟ انبیاء علیہم السلام کا تو جو اسوہ ہے، آپ نے دیکھا وہ اس طرح کی کوئی رعایت ہمیں دینے کے لیے بالکل تیار نہیں۔ ہاں اگر ہم نے انبیاء علیہم السلام کی سرگذشتوں کو عملاً خدانخواستہ، مشرکین عرب کی طرح "اساطیر الاولین" کی حیثیت دے رکھی ہے، اور انہیں ایسی گزری ہوئی داستانیں سمجھ بیٹھے ہیں جن کو ہمارے افکار و اعمال کا رخ متعین کرنے میں کوئی دخل ہی حاصل نہیں، تب تو بات ہی دوسری ہے لیکن اگر صورت واقعہ یہ نہیں ہے اور ہماری بدبختیوں نے ابھی تک ہمیں نسوا اللہ فانساھم انفسھم کی حد تک نہیں گرایا گیا ہے بلکہ ہم ان سرگذشتوں کی اسی ہدایت کا مینار اور بصیرت کا سرچشمہ یقین کرتے ہیں جس طرح قرآن بتاتا ہے تو ان کے ورق ورق سے ہمیں یہ ہی ہدایت ملے گی کہ جو چیز تمہارا فریضۂ حیات قرار پاچکی اس کی خاطر جدوجہد تم کسی حال میں بھی نہیں چھوڑ سکتے۔

ناسازگاری احوال کا واقعی تقاضا

کہا جائے گا کہ حالات بہر حال اپنا ایک وزن رکھتے ہیں اور انسان کے فکر و عمل پر لازماً اثر انداز ہوتے ہیں اس لیے عقل یہ کس طرح تسلیم کر لے کہ دعوت حق کے سلسلے میں وہ کسی اعتنا کے قابل ہیں ہی نہیں؟ بلاشبہ یہ ایک صحیح اور معقول بات ہے اور اس کی صحت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اوپر کی سطروں میں یہ بات کب اور کہاں کہی گئی ہے کہ حالات کا دعوت حق کی جدوجہد پر اثر بالکل پڑتا ہی نہیں؟ ان میں تو جو بات کہی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ حالات کی ناسازگاریاں اس جدوجہد کو ملتوی یا منسوخ نہیں کرا سکتیں۔ اب رہا یہ سوال کہ پھر وہ اس جدوجہد پر کس حیثیت سے اثر انداز ہوتی ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ جتنی ہی زیادہ سخت و شدید ہوتی ہیں اس جدوجہد کو اتنا ہی زیادہ ضروری بنا دیتی ہیں؟..............................

یہ جواب نقل اور عقل دونوں ہی کا ہے۔

ا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر نبی عموماً ایسے ہی وقت میں اس کام پر مامور کیا جاتا ہے جب کہ حق کی روشنی اس زمین سے بالکل ہی مفقود ہو چکی ہوتی تھی، اور کفر و مادیت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے اس کی دعوت کا امکان کامیابی دور دور تک بھی کہیں نظر نہ آتا تھا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ جدوجہد ایسے ہی ماحول سے زیادہ مانوس ہے اور حق تعالیٰ کی مرضی اسی بات میں ہے کہ اس طرح کے تاریک حالات میں صداقت کا چراغ ضرور جلایا جائے اور اس کے بندے اس کے دین کے لیے جو کچھ بھی کر سکتے ہوں اس سے ہرگز دریغ نہ کریں اور یہ غالباً اس کے لیے اس کی رفت و رحمت کو اس گہری تاریکی کا اور بڑھ جانا گوارا نہیں رہ جاتا۔

۲۔ ٹھیک یہی بات عقل بھی کہتی ہے وہ کہتی ہے کہ جب اللہ کا دین نوع انسانی کے لیے ہدایت اور روشنی ہے تو جس جگہ کا انسان جتنا زیادہ گمراہی اور تیرگی کا شکار ہوگا اس جگہ اس ہدایت اور روشنی کی ضرورت بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ دعوت حق کے لیے سخت و شدید ناسازگاریوں کے معنی یہ ہیں کہ حق سے بے اعتنائی اور دوری حد سے آگے بڑھ چکی ہے اور لوگ اندھیارے سے محبت کرنے لگے ہیں اس لیے ان ناسازگاریوں کا واقعی تقاضا صرف یہی ہوگا کہ جو لوگ انسانیت کو نور حق دکھانے پر مامور ہیں۔ وہ خاموشی کو اپنے اوپر حرام کر لیں اور اونچی سی آواز میں انہیں اپنا پیغام سنائیں۔ جو ہلاکت کی راہ پر اندھا دھند بھاگے چلے جا رہے ہیں اگر دوسری طرف کے حالات میں ان کے لیے کچھ سہل انگاری کی گنجائش مان بھی لی جائے تو کم از کم اس طرح کی غیر معمولی بیزاری کی حالت میں ایسی کوئی گنجائش قطعاً نہیں مانی جا سکتی حفظان صحت کا کوئی محکمہ اگر وبا پھوٹ پڑنے پر بھی خواب خرگوش سے نہ جاگے تو اس کی فرض شناسی کی داد کون دے سکتا ہے؟

عقل اور نقل دونوں کے اس متفقہ جواب کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس زمانہ میں لوگ حق سے جتنا ہی زیادہ بے گانہ ہوں، دہریت اور مادیت کی جتنی ہی زیادہ گرم بازاری ہو، طاغوت کی حکمرانی جتنی ہی زیادہ وسیع، ہمہ گیر، اور پائیدار ہو حق کے علمبرداروں پر دین اللہ کی اقامت کا فریضہ اتنا ہی زیادہ اہم اور ضروری ہو جاتا ہے اس لیے اگر موجودہ حالات کے بارے میں یہ اندازہ صحیح ہے کہ اس وقت دنیا حق سے بری طرح متنفر اور برگشتہ ہو رہی ہے اور سارے اس کا نام سننا بھی گوارا نہیں تو یہ صورت حال اقامت دین کی جدوجہد میں کسی رعایت کی موجب بالکل نہیں ہوتی بلکہ یہ مطالبہ اس بات کا کرتی ہے کہ اس مہم کو معمولی سے زیادہ جوش، سرگرمی اور نہاک سے انجام دیا جائے۔

ایک اور پہلو سے دیکھیے تو معاملہ کی اہمیت اور بھی آگے بڑھی ہوئی معلوم ہوگی۔ یعنی بات صرف اتنی ہی رہ جائے گی کہ اقامت دین کی جدوجہد امکان وعدم امکان کی بحث سے بالاتر ہے اور اس کو ہر وقت، ہر ماحول اور ہر حالت میں جاری رکھنا چاہیے۔ بلکہ اس حد کو پہنچ جائے گی کہ اگر حالات کے اندازے اس جدوجہد کی ناکامی کا یقین دلا رہے ہوں، حتیٰ کہ بالفرض اگر کوئی اپنی آنکھوں سے نوشتہ الٰہی میں اس ناکامی کو مقدر دیکھ لے تو بھی اس کے لیے اس میں لگے رہے بغیر چارہ نہیں۔ کیونکہ یہ دنیا کی عام تحریکوں اور اسکیموں جیسی کوئی تحریک اور اسکیم نہیں ہے۔ کہ اگر اس کی کامیابی کے

ذرائع مفقود اور امکانات ناپید نظر آئیں تو اس سے دست کش ہو جانے میں بھی کوئی حرج نہ ہو۔ نہ یہ مسلمانوں کے سر پر کوئی اوپر سے چپکی ہوئی ذمے داری ہے کہ چاہا تو قبول کر لیا ورنہ ٹھکرا دیا۔ اور اگر قبول بھی کر لیا تو پھر جب چاہا اس کو اپنے پروگرام سے خارج کر لیا ورنہ ٹھکرا دیا۔ اور اگر قبول بھی کر لیا تو پھر جب چاہا اس کو اپنے پروگرام سے خارج کر دیا اس کے برعکس ایک شخص کے مسلمان ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس نے اس دین کی اقامت کے لیے اپنے کو وقف کر دیا ہے۔ اللہ پر ایمان لانے اور حق سے محبت کرنے کا فطری مطالبہ ہی یہ ہے کہ جو چیزیں خدا کو محبوب ہوں اور جو باتیں حق ہوں انسان ان کو خود بھی اپنائے اور انہی کو اپنے گرد وپیش بھی زندہ اور کار فرما دیکھنے کا دل سے آرزو مند ہو اور انہیں کار فرما بنا دینے کے لیے ہمہ دم کوشاں رہے۔ اسی طرح ہر اس چیز کو مٹا دینے کے لیے بے قرار اور مصروف تگ وتاز نظر آئے جو خدا کو ناپسند اور خلاف حق ہوں۔ چنانچہ اوپر نبی ﷺ کے ارشادات سے یہ حقیقت بالکل واضح کی جا چکی ہے کہ جس طرح آگ اور پانی کا اتحاد ممکن نہیں اسی طرح ایمان اور منکرات میں مصالحت ممکن نہیں۔ لہٰذا منکرات کو مٹانے اور ان کی جگہ معروفات کو قائم کرنے کی جدوجہد، اقامت دین کی جدوجہد ہی کا دوسرا نام ہے، اسلام سے علیحدہ اور اس پر زائد کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اس کی اصل روح اور اس کی حرکت قلب ہے اگر یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی جاندار زندہ تو ہو مگر اس کے قلب میں حرکت نہ ہو تو اسی طرح یہ بھی تصور نہیں کیا جا سکتا کہ ایک شخص ہو تو مومن، مگر اقامت حق کی تڑپ سے اس کے دل ودماغ خالی ہوں اور عملی جدوجہد سے اس کے دست وبازو یکسر ناآشنا، اس تڑپ سے خالی اور اس جدوجہد سے ناآشنا ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب دراصل اپنے مقصد حیات ہی سے کنارہ کش ہو جانے کے ہیں جس کے بعد ظاہر ہے کہ مسلمان کا وجود ہی بے معنی ہو جاتا ہے چنانچہ اہل کتاب کے متعلق جنہوں نے کہ اپنے اس مقصد زندگی کو فراموش کر رکھا تھا، قرآن نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جب تم تورات وانجیل کو قائم نہ کرو تم کسی اصل پر نہیں ہو اور تمہارا ملی وجود ایک وجود موہوم کے سوا کچھ نہیں۔(لستم علی شیٔ حتیٰ تقیموا التوراۃ و الانجیل و ما انزل الیکم من ربکم)اس لیے یہ کہنا کہ اس زمانے میں اقامت دین ناممکن ہے گویا یہ کہنا ہے کہ اس زمانے میں مسلمان ہونا ممکن نہیں ہے اور حالات زمانہ کی ناسازگاری کے پیش نظر اقامت دین کی جدوجہد کو ترک کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خود اسلام ہی سے دست بردار ہو جانے کو بھی غلط نہ سمجھا جائے۔

غیرت کا سبق

یہ بات کہ جو چیز زندگی کا اصل فریضہ قرار پا چکی ہو وہ امکان اور عدم امکان کی بحث سے بالاتر ہو جاتی ہے، کچھ اسلام اور مسلمان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ایک عام اور مسلم حقیقت ہے۔ چنانہ انبیاء اور ان کے سچے پیروؤں نے اس مطالبہ کو پورا کر دکھایا ہے تو کافروں اور دہریوں کے یہاں بھی اس مطالبے کو ایک واجب التسلیم مطالبے ہی کی حیثیت حاصل ہے اور وہ بھی نصب العین کے معنی یہی سمجھتے ہیں کہ نصب العین وہ چیز ہے جو آنکھوں سے کبھی اوجھل نہ ہو۔ جو زندگی کے میدان میں آنے کے لیے ایسے حالات کی اجازت کی محتاج نہ ہو جو ماحول کی سازگاریوں کی خواہش مند تو ہو مگر ناسازگاریوں سے خوف بھی نہ کھاتی ہو اور جس کی خاطر جدوجہد میں اگر زندگی ختم نہ کی جا سکے تو بالکل رائگاں ہے چنانچہ ان کی تاریخ اس بات کی عملی شہادتوں سے بھری پڑی ہے۔

مارکس کے پیروؤں ہی کو لے لیجیے اس کے چند مخصوص نظریات تھے جن پر وہ ایمان لائے اور انہی نظریات کی اقامت کو انہوں نے انسانی مسائل کا صحیح حل سمجھا۔ اس لیے اسی کام کو انہوں نے اپنی زندگیوں کا نصب العین بنا لیا اور اس کے لیے پوری یکسوئی اور کامل انہماک سے سعی وجدوجہد شروع کر دی۔ یہ سعی وجہد سب سے زیادہ زور وقوت سے اس مملکت میں شروع کی گئی جس میں وقت کی سب سے مستبد حکومت قائم تھی۔ جہاں زار نکولس کی شخصی آمریت اور قہاریت کے خلاف سانس لینا بھی بظاہر ممکن نہ تھا مگر اشتراکی اصولوں پر معاشرے اور حکومت کی تنظیم کو اپنا مقصد زندگی قرار دینے والوں نے ان دشواریوں، ناسازگاریوں اور مصیبتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں جو اس جدوجہد کے پردے میں چھپی انہیں

گھور رہی تھی جب زار کے کانوں تک ان کی سر گرمیوں کی اطلاع پہنچی تو وہ ظلم اور انتقام کے تمام اسلحوں سے مسلح ہو کر پوری خشمناکی کے ساتھ ان پر ٹوٹ پڑا۔ کتنوں ہی کو تو اس نے موت کے گھاٹ اتار دیا، جو بچ رہے ان کو سائبیریا کے برفشانی جہنم میں جھونک دیا۔ ظلم اور ایذادہی کی کوئی ممکن صورت ایسی نہ تھی جس سے اشتراکیت کے ان "مومنوں" کو سابقہ نہ پڑا ہو۔ سالہا سال تک دار و گیر کا یہی ہنگامہ بپا رہا۔ مگر کوئی بڑی سے بڑی مصیبت اور ناسازگاری بھی ان کے عزم کو نہ ہلا سکی اور اشتراکیت کا عشق آلام و مصائب کے طوفانوں سے انہیں برابر لڑاتا رہا اور منزل مقصود کی طرف ان کے قدم لگاتار بڑھواتا ہی رہا۔

انہی اشتراکیوں میں آگے چل کر جب کہ وہ زار کا تخت سلطنت الٹ کر اپنا اشتراکی نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے، باہم اختلاف ہو گیا۔ لینن کی وفات کے بعد سیاست کی باگ ڈور اسٹالین کے ہاتھوں میں آگئی جس نے آہستہ آہستہ اشتراکی نظام کو بین الاقوامیت کی سطح سے ہٹا کر قومی اشتراکیت کی سطح پر لانا شروع کیا۔ اس کی اس پالیسی سے جو اصولی اشتراکیت سے فی الواقع بالکل ہٹی ہوئی پالیسی تھی اور دراصل مارکس نظریات کے ساتھ کھلی ہوئی غداری تھی ٹراٹسکی نے اختلاف کیا، اور اشتراکیت کی اصلی روح اور خالی مارکسیت کے قائم کرنے پر اور قائم رکھنے پر زور دیا۔ اسٹالین نے نہ صرف یہ کہ اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا بلکہ اس کو اس جرم کی پاداش میں حکومتی ادارے سے ہی نکال دیا۔ خفیہ پولیس نے اس پر اور اس کے ہم خیالوں پر کڑی نگرانی عائد کر دی اور اس کی زبان پر تالے چڑھا دیئے گئے۔ مگر وہ جن اصولوں پر ایمان رکھتا تھا اور جن کے نفاذ میں اس کو دنیا کی فلاح نظر آرہی تھی ان کی تبلیغ سے وہ باز نہ رہا۔ آخر جلا وطن کر دیا گیا۔ امریکہ پہنچا اور وہاں سے اپنے مشن کو پھیلانے اور اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اس کے دشمن وہاں بھی پہنچے، اور ایک روز سازشوں کے ذریعے انہوں نے اس کے سامنے موت کا پیالہ پیش کر دیا، جسے مارکسیت کے اس "مومن قانت" نے نہایت صبر و سکون کے ساتھ قبول کر لیا اور اپنے مقصد و نصب العین پر قربان ہو گیا۔

یہ تو کچھ پرانی باتیں ہیں، ذرا قریب کی تاریخ دیکھیے یہ جاپانی اور جرمن قومیں جو زخموں سے چور آپ کے سامنے پڑی ہیں ان کے واقعات سنیے۔ ان کے رہنماؤں نے ان کے سامنے ایک نصب العین رکھا۔ ان پر ایمان لائیں اور پھر اس کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں۔ حریف قوموں نے روکا، انہوں نے اس روک کو تلوار کی نوک سے دور کرنے کی ٹھان لی، لڑائی کا میدان گرم ہو گیا اور یہ دونوں قومیں اپنے اپنے دائروں میں سیلاب کی طرح آگے بڑھنے لگیں اور چند ہفتوں کے اندر اندر ہزاروں مربع میل علاقوں پر قابض ہو گئیں۔ مگر قسمت نے یکایک پلٹا کھایا تو پھر اسی تیزی سے وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئیں اور تباہیوں کی ان پر بری طرح بارش ہونے لگی۔ مگر اپنے نصب العین کا یہ عشق تھا کہ ان کے نوجوان موت کو منہ کھولے ہوئے دیکھتے اور اس میں کود جاتے۔ ہوائی جہازوں سے چھلانگ لگاتے اور بم لے کر سیدھے دشمن کے جنگی جہازوں کی چمنیوں میں جا پڑتے۔ بموں سے لدا ہوا ہوائی جہاز لے کر ان کے جہازوں پر جا گرتے۔ اور اس طرح دنیا کی جنگی لغت میں "خودکش ہوائی جہاز" اور "کفن بردوش" طیارے کی اصطلاحوں کا اضافہ کر گئے۔ پھر آخر میں جب قدرت نے ان کو اپنی آرزوؤں میں قطعی حد تک ناکام بنا دیا تو وہ اس عقیدے کے ساتھ "ہرکیری" (خودکشی) کرنے لگے کہ مرنے کے بعد دیوتا بن کر اپنی قوم کی خدمت اور اپنے مقصد کی خاطر جنگ کریں گے۔ اور ان کی عورتیں اپنے نوزائیدہ بچوں کی پرورش اس جذبے سے کرنے لگیں کہ یہ بڑے ہو کر دشمنوں سے اپنی قومی عظمت کی تباہی کا انتقام لیں گے۔

یہ ان لوگوں کے نظریئے اور کارنامے ہیں جن کا کوئی مستقبل نہیں۔ جن کی قربانیوں کا کوئی ثمرہ مرنے کے بعد ان کو.................. ملنے والا نہیں۔ اور جن کے سامنے اگر کچھ ہے تو صرف اسی دنیا کے رذیل مقاصد ہیں۔ کیا ان واقعات اور حقائق میں ہمارے لیے عبرت کا کوئی درس اور غیرت کا کوئی پیام نہیں؟ کیا رضائے الٰہی اور سعادت اخروی میں اتنی بھی گہرائی نہیں جتنی کہ ان چند روزہ مادی مقاصد میں ہے؟ کیا ایمان باللہ میں اتنی بھی حرارت نہیں ہو سکتی جتنی کہ ایمان بالطاغوت میں دیکھی جا رہی ہے۔ کیا حق کی شہادت میں اتنی بھی حرارت نہیں دکھائی جانی چاہیے جتنی کہ باطل کی شہادت میں اس کے ماننے والے دکھایا کرتے ہیں؟ اور کیا اپنے فریضۂ حیات کو اتنی اہمیت بھی اہل اسلام دینے کو تیار نہیں جتنی کہ اہل کفر دے

رہے ہیں؟انبیائے کرام کے واقعات کو نفس حیلہ گر پیغمبرانہ جوشِ تبلیغ اور روح کی غیبی تائید کا نتیجہ قرار دے کر ٹال سکتا ہے۔ مگر اہل کفر وضلال کی ان سرفروشیوں کے پیچھے کسی معجزے اور غیبی تائید کا سراغ بتایا جا سکے گا؟ کاش ہم................. امکان وعدم امکان کی بحثیں چھیڑتے وقت باطل پرستوں ہی کے اعمال واخلاق پر ایک نظر ڈال لیتے اور انہی سے مقصد زندگی کا حق ادا کرنا سیکھ لیتے۔افسوس یہ منظر بھی کتنا عبرت ناک ہے۔ جن کی نظر اسی عالم آب وگل تک ہے وہ تو ادائے فرض میں فکر انجام سے اتنے بلند ہوں اور وہ جن کا دعویٰ ہے کہ ہماری نماز اور ہماری قربانی، ہماری زندگی اور ہماری موت سب کچھ صرف اللہ کے لیے ہے، ناکامی کے اندیشے ڈھونڈنے میں مصروف ہیں۔ جو نقش حقیقت ایک اندھا ملحد بھی ہاتھوں سے ٹٹول کر معلوم کر لیتا ہے وہ ایمان کی روشنی رکھنے والی آنکھوں کو ذرا سجھائی نہیں دیتا۔

جذباتیت کا بے نیاد طعنہ

اگرچہ اس تقریر کے بعد یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ ادائے فرض کے سلسلے میں امکان کی بحث پیدا ہی نہیں ہوتی۔اور ایمان کی غیرت اس کے تصور تک کو برداشت نہیں کر سکتی۔ نیز ایمان کی غیرت تو الگ رہی کوئی خوددار اور باحمیت کفر بھی اس کا روادار نہیں ہو سکتا۔ مگر اس کے باوجود ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ بات اس وقت کے مصلحت پرست اور عاقبت پسند دماغوں میں شاید ہی گھس پائے گی اور ہر گز خلاف توقع نہ ہو گا اگر دانش و تدبر کے کتنے ہی دعویدار اک خاص بزرگانہ شان سے بول اٹھیں کہ یہ سب جذباتی باتیں ہیں جن کا دنیائے عمل سے کوئی تعلق نہیں۔"اہل دانش" کے اس ایمارک کو بڑی خوشی کے ساتھ قبول کر لیا جاتا۔ اگر قبول کرنے کی کچھ بھی گنجائش ہوتی، کیونکہ ذمے داری کا ایسا بھاری بوجھ اٹھانے اور خطروں سے اس طرح روندی ہوئی راہ اختیار کرنے کا خواہ مخواہ کسی کو کوئی شوق نہیں ہو سکتا مگر دشواری یہ ہے کہ اس رائے کے قبول کرنے سے ہماری مشکل حل نہیں ہوتی بلکہ اس میں مزید گرہیں پڑ جاتی ہیں کیونکہ پھر وہی عقل جس کی دہائی دی جا رہی ہے پکار کر پوچھتی ہے کہ ایسا دین قبول ہی کیوں کیا جائے جو بار بار اور کھلم کھلا اس جذباتی طرز عمل کی تلقین کرتا ہو۔ اگر ایک شخص کسی دین کی سچائی تسلیم کرتا اور اس کی اتباع کا عہد کرتا ہے تو اس کو لازم ہے کہ دہکتے ہوئے الاؤ کے اندر بھی کود پڑنے میں کوئی پس وپیش نہ کرے اگر اس کے دین کا بالفرض اس سے یہ مطالبہ ہو، لیکن اگر وہ اس کے مطالبات کو سن کر ٹال دیتا ہے اور انہیں جذباتی................. دوسرے لفظوں میں ناقابل عمل اور غیر معقول خیال کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ فی الواقع اس کا اس پر ایمان ہی نہیں، اس کا ایمان اگر ہے تو اپنی عقل وفہم پر ہے اس لیے ایمان داری کا تقاضا یہ ہے کہ اس دین کے نام سے اصول ومسائل پر بحث کرنے سے پہلے وہ اپنی پوزیشن کی تعیین کرے۔

لیکن کیا واقعتاً یہ بات جذباتی ہی ہے اور اس مطالبے کی بنیاد نرے جذبات ہی پر ہے؟ نیز کیا جذبات کی ہماری عملی زندگی میں کوئی اہمیت اور ضرورت بالکل ہے ہی نہیں؟ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے اس کے بارے میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ پچھلے صفات میں جو بحثیں کی جا چکی ہیں ان میں اس خیال کی تردید کا پورا پورا مواد موجود ہے۔ رہ گیا دوسرا سوال تو تھوڑے سے غور وفکر کے بعد اس کا جواب بھی آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔ جائزہ لے کر دیکھیے کہ دنیا میں بڑی بڑی مہمیں کس طرح سر کی جایا کرتی ہیں؟ آیا محض نظری فلسفوں ہی سے یا جذبات کی مدد بھی ضروری ہوتی ہے؟ یہ جائزہ آپ کو یقیناً اس نتیجہ پر پہنچائے گا کہ کسی بھی بڑے کام میں کامیابی کا انحصار عقل، اور جذبات دونوں پر ہوتا ہے اس میں جس طرح عقل وتدبر کے ٹھنڈے فلسفوں سے بے اعتنائی نہیں برتی جا سکتی۔ اسی طرح جذبات کی گرم لہروں سے بھی بے نیازی ممکن نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دونوں کے وظائف الگ الگ ہو سکتے ہیں اس لیے اگر وہ کام جو عقل کے کرنے کا ہے جذبات کے ہاتھوں میں دے دیا گیا تو اس کا نتیجہ لازماً ناکامی ہی کی شکل میں نمودار ہو گا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ کسی مقصد کی تعیین تو صرف عقل ہی کرتی ہے یہ عقل ہی کا کام ہے کہ پوری پوری چھان بین کر کے بتائے کہ انسان کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے پھر یہ کہ کرنے کے کاموں میں سے کون سے کام صرف بہتر ہیں اور کون سے ضروری؟ نیز جو ضروری ہیں ان کے مراتب کیا ہیں۔ ان میں سے کس کی حیثیت بنیادی قسم کی ہے اور کس کی غیر بنیادی نوعیت کی؟ جب اس بارے میں وہ اپنا فیصلہ دے دے تو پھر انسان پر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ مختلف کاموں کو اپنے پروگرام میں وہی جگہ دے جو اس نے دینے کو کہا ہو اور اس طرح اسی چیز کو اپنے لیے ضروری یا بنیادی اہمیت کا مالک ٹھیرائے جسے اس کی عقل ایسا ٹھیرا چکی ہو اس مسئلہ میں اپنے جذبات کو چوں کرنے کی بھی اجازت نہ دے۔ ورنہ اسے بجا طور پر جذباتی اور احمق کہا جائے گا مگر جب عقل اپنا فریضۂ انجام دے چکی اور گہرے سوچ وبچار کے بعد ایک شے کو ضروری قرار دے چکی تو اب وہ موقع آجاتا ہے جہاں جذبات کی شرکت اور ضرورت ناگزیر ہو جاتی ہے کیونکہ آگے عقل محض کے بس کا یہ کام ہے ہیں نہیں کہ وہ اس منزل مقصود کی طرف قدموں کو مطلوبہ رفتار سے بڑھا سکے یہ کام وہ اسی وقت انجام دے سکتی ہے جب جذبات کی معاونت بھی حاصل کر لے۔ بلکہ زیادہ صحیح بات تو یہ ہے کہ یہاں عملی اہمیت کے لحاظ سے جذبات عقل پر بھی مقدم ہو جاتے ہیں۔ معاملے کے یہاں تک پہنچ چکنے کے بعد اب دراصل یہ جذبات ہی ہوتے ہیں جو دلوں میں عمل کا ولولہ اور قدموں میں حرکت واقدام کا وہ جوش پیدا کرتے ہیں جن کے بغیر منزل تک رسائی ناممکن ہے۔ یہ جذبات اگر آمادہ کار نہ ہوں تو عمل کی قوتیں سوئی پڑی رہ جائیں گی اور مقصد کی بڑی سے بڑی جاذبیت بھی انہیں جھنجھوڑ کر بیدار نہ کر سکے گی۔ یوں کہئے کہ عقل صرف سمت سفر متعین کرتی اور انجن اور پٹڑی تیار کرتی ہے مگر اس انجن کو حرکت دینے والی اور منزل مقصود تک اسے دوڑا دینے والی اسٹیم یہی جذبات مہیا کرتے ہیں۔ جذبات نے انسانی زندگی کی تعمیر میں اور اہم مقاصد کے حصول میں یہ مقام غاصبانہ طور پر حاصل نہیں کی ہے بلکہ ان کا یہ ایک فطری حق ہے اور عقل نے اس حق کو تسلیم کرنے سے کبھی انکار نہیں کیا ہے اس لیے جس طرح مقاصد کی تعیین میں جذبات سے کام نہ لینا عقلیت ہے۔ اسی طرح ان مقاصد کے حصول میں جذبات سے بیش از بیش کام لینا بھی عقلیت ہی ہے جذباتیت نہیں ہے۔

عقل اور جذبات کے ان الگ الگ وظائف کو سامنے رکھئے اور پھر انصاف سے فیصلہ کیجیے کہ جب اس نے پورے اطمینان کے ساتھ اسلام کو اللہ کا واجب الاتباع دین مان لیا تو اس کے مطالبات کی تکمیل میں جذبات کی پوری قوت لگا دینا آیا جذباتیت ہے یا عقلیت؟ کوئی شبہ نہیں کہ اس کا فیصل یہی ہو گا کہ یہ خالص عقلیت ہے۔ لہٰذا اسلام پر ایمان رکھنے اور اقامت دین کو اپنا فریضۂ حیات تسلیم کرنے کے باوجود اس کے لیے اٹھ کھڑے ہونے سے لیت ولعل کرنا دانش مندی نہیں بلکہ دانش فروشی ہے۔ عقل وتدبر کا نام لے کر عقلیت کو رسوا کرنا ہے۔

غلط روی کے اسباب

بحث کے ان سارے پہلوؤں کے روشن ہو جانے کے بعد ذہن میں قدرتاً ایک بڑا نازک سوال ابھرنے لگتا ہے اور وہ یہ کہ جب بات اتنی واضح تھی تو پھر لوگ حالات کی سازگاریوں اور ناسازگاریوں کی بحث میں کیوں جا الجھے؟ اور امکان وعدم امکان کے اس مسئلے نے ان کے ذہنوں میں کہاں سے بار پالیا۔ جس کے نتیجے میں وہ اپنے فریضۂ حیات سے یوں بے تعلق ہو کر رہ گئے۔ حقیقت کا علم تو اللہ ہی کے پاس ہے، مگر جہاں تک انسانی فہم کی رسائی کا تعلق ہے یہ غلط روی بظاہر ان دونوں باتوں کو نہ سمجھ پانے کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

ایک تو یہ کہ امامت دین کا فریضۂ حیات ہونے، اور پھر اس فریضے سے عہدہ برآ ہونے کے اصل معنی کیا ہیں؟

دوسری یہ کہ اس فریضے کی خاطر کی جانے والی جدوجہد میں کامیابی کا مفہوم کیا ہے؟

اس لیے اگر ان دونوں باتوں کو اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے اور ذہن کو ٹھیک اس سانچے میں ڈھال لیا جائے جو قرآن عطا کرتا ہے تو پھر نہ حالات کی ناسازگاریوں کا کوئی سوال باقی رہے گا، نہ امکان اور عدم امکان کی بحث پیدا ہو گی۔

مومن کی اصل ذمے داری

جب یہ کہا جاتا ہے کہ دین کی اقامت اہل ایمان پر فرض ہے تو اس کا مطلب غالباً یہ لے لیا جاتا ہے کہ زمین پر اسلامی نظام زندگی کو بالفعل قائم اور نافذ کر دین کو ہمارا فرض کہا جا رہا ہے حالانکہ یہ صریح غلط فہمی ہے ہم پر تو جو چیز فرض ہے اور جس کی ہم سب اللہ تعالیٰ کے یہاں پرسش ہو گی وہ دین کو بالفعل قائم کر دینا نہیں ہے۔ بلکہ اس کو قائم کر دینے کی اپنی پوری طاقت سے جدوجہد کرنا ہے جس نے یہ کر لیا وہ اپنے فرض کو پورا کر گیا، اگرچہ ایک شخص نے بھی اس کی بات نہ مانی ہو، اور ایک ذرہ زمین پر بھی وہ دین حق کو قائم نہ کر پایا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان پر اتنا ہی بوجھ ڈالا ہے جتنا وہ اٹھا سکتا ہے (لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا) اس نے کسی پر کوئی ایسی ذمے داری ڈالی ہی نہیں ہے جو اس کی فطری صلاحیتوں اور قوتوں سے زیادہ ہو۔ مثلاً اس نے ہم سے مطالبہ کیا ہے کہ ہم اس کا تقویٰ اختیار کریں۔ مگر اس کا یہ مطالبہ ہماری واقعی سکت سے بڑھ کر نہیں ہے بلکہ اسی حد تک ہے کہ ہماری خلقی استطاعت کے بس میں ہو۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے:

اتقوا اللہ ما استطعتم (تغابن: ۱۶)

اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، جس قدر تم کر سکتے ہو۔"

یا مثلاً مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ اعدائے دین کا مقابلہ کرنے اور ان کا زور توڑ ڈالنے کے لیے تیار رہیں مگر اس کے لیے ان سے یہ مطالبہ نہیں کیا گیا ہے کہ جس طرح بھی ہو دشمنوں کی قوت جنگ کے برابر قوت لازماً فراہم کریں، بلکہ صرف یہ کہا گیا ہے اور اتنا ہی ان پر واجب کیا گیا ہے کہ:

اعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ الخ (انفال)

"دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اتنی قوت تیار رکھو جتنی کہ کر سکتے ہو۔"

اسی طرح نبی ﷺ سے جب لوگ اطاعت کی بیعت کرتے تو آپ ان کے الفاظ بیعت میں خود اپنی طرف سے تا حد استطاعت کی قید بڑھا دیتے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں:

کنا نبایع رسول اللہ ﷺ علی السمع و اطاعتہ یقول لنا فیما استطعت (مسلم: جلد دوم)

ہم نبی ﷺ سے سمع و طاعت کی بیعت کرتے تو آپ ﷺ فرماتے کہ یہ بھی کہو کہ جہاں تک میری طاقت ہو گا۔

غرض دین کا یہ ایک مسلم اصول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام کی بجاآوری کا جو مطالبہ فرمایا ہے وہ انسان کی واقعی طاقت کی حد ہی تک کا ہے اس سے زیادہ کا قطعاً نہیں ہے اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اقامت دین کے معاملے میں بھی اس اصول کا لحاظ نہ ہو۔ یقیناً ہو گا اور اس کام میں حالات کی ناسازگاریاں، ماحول کی دقتیں اور ذرائع کی کم یابیاں جس قدر مزاحم ہوں گی اسی قدر ہمیں اللہ تعالیٰ کی جناب سے رعایت بھی ضرور ملے گی۔ اسی طرح مختلف افراد کے حق میں ان موانع کی نوعیتوں کا جو تفاوت ہو گا، اس تفاوت کا بھی پورا پورا لحاظ فرمایا جائے اور ہر فرد کو اس کے دربار عدل میں صرف اسی حد تک جواب دہی کرنی پڑے گی جس حد تک اسے جدوجہد کی طاقت میسر ہے۔ اگر ایک شخص کو کام کے اچھے ذرائع اور ماحول کی سازگاریاں حاصل ہیں لیکن اس کے باوجود اپنے مقدور بھر قیام دین کی کوشش بجا نہیں لاتا تو لازماً ادائے فرض میں کوتاہی دکھانے کا مجرم قرار پائے گا۔ خواہ اپنی اس کم توجہی کے باوجود ظاہری نتائج کے اعتبار سے کتنا ہی آگے کیوں نہ نکل گیا ہو۔ اس کے بخلاف اگر دوسرے شخص نے اپنے تمام

ممکن کوششیں طرف کرڈالیں لیکن ذرائع کے ناپید اور حالات کے ناسازگار ہونے کے باعث آخر تک کچھ نہ کر پایا، اور بس منزل مقصود کی سمت اپنا رخ جمائے وہیں کا وہی کھڑا رہ گیا تو جہاں سے اس نے اپنی کوششوں کا آغاز کیا تھا تو اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ وہ ہر طرح اپنے فرض کو ادا کر گیا اور اللہ کے حضور اس پر کوئی الزام نہ لگے گا۔ اس لیے مومن کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ جیسی کچھ اسے طاقت حاصل ہو اور جس طرح کے حالات میں وہ ہو، انہی کے مطابق اپنی کوششیں انجام دیتا رہے۔ پھر جیسے جیسے ان حالات میں تغیر ہوتا، اور اس کی اپنی قوت کار میں فرق آتا جائے۔ اپنی جدوجہد کا دائرہ بھی اس کی مناسب یا وسیع کرتا رہے۔

اس بات کو ایک مثال سے سمجھیے، نماز ہم پر فرض ہے جس میں قیام، رکوع اور سجدہ وغیرہ چند چیزوں کا ادا کرنا ضروری ہے۔ ایک شخص اگر قیام پر قادر ہونے کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے تو اس کی نماز نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ اگر کسی واقعی مجبوری کی وجہ سے وہ بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہو۔ لیکن دو رکعتیں پڑھ چکنے کے بعد اس کی یہ مجبوری دور ہو جاتی ہو اور اب وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے پر قادر ہو گیا ہو تو اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ باقی رکعتیں وہ کھڑے ہو کر ہی پڑھے اور جیسے ہی اسے اپنے عذر کے جاتے رہنے کا احساس ہو جائے فوراً اٹھ کھڑا ہو۔ ٹھیک یہی حال اقامت دین کی جدوجہد کا بھی ہے۔ جس شخص کو جس وقت جتنی قوت میسر ہو اس وقت اتنی ہی جدوجہد اس کے لیے ضروری ہے، نہ اس سے زیادہ کا وہ مکلف ہے نہ اس سے کم میں اس کی خیر ہے۔ زمین پر مکمل طور پر اللہ کے دین کو بالفعل قائم اور نافذ کر دینا۔ ایک آخری غایت (گول) ہے جہاں تک پہنچنے کی مسلسل کوشش مسلمانوں کی منصبی ذمے داری ہے اور جہاں تک پہنچ جانا ہر مسلمان کی لازماً محبوب آرزو ہونی چاہیے۔ مگر وہاں بہر صورت پہنچ جانا اس پر واجب ہر گز نہیں قرار دیا گیا ہے۔ اس پر جو کچھ واجب قرار دیا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس گول کی طرف اتنے قدم آگے بڑھتا جائے جتنے قدم کہ وہ فی الواقع آگے بڑھ سکتا ہے۔

واقعی ناکامی کا عدم امکان

جب اقامت دین کے فرض ہونے کا مدعا یہ ہے تو یہی سے یہ سوال بھی حل ہو جاتا ہے کہ اس فریضے کی خاطر کی جانے والی جدوجہد میں کامیابی کا واقعی مفہوم کیا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ جب اپنی استطاعت کے مطابق ہی کوشش کرنے کے ہم مکلف ہیں تو پھر اس راہ میں ناکامی کا کیا امکان باقی رہتا ہے؟ یہ تو وہ راہ ہے جو خود ہی راہ بھی ہے، خود ہی منزل بھی، دنیا کی دوسری تمام تحریکوں اور سرگرمیوں کا معاملہ تو ضرور ایسا ہے کہ ان میں پوری پوری کوشش کے باوجود کامیابی کا بھی امکان ہوتا ہے اور ناکامی کا بھی۔ لیکن اقامت دین کی جدوجہد ایک ایسی جدوجہد ہے جس میں اگر پوری پوری کوشش انجام دے دی گئی تو پھر ناکامی کا کوئی امکان باقی ہی نہیں رہتا۔ کیونکہ مومن سے اس کے رب کا مطالبہ اس سے زیادہ کا ہے ہی نہیں کہ بس وہ اپنی طاقت اس کام میں لگا دے، اور اپنی آخری سانس تک لگائے رکھے۔ کل اس سے حساب بھی صرف اسی بات کا لیا جائے گا جس میں اگر ثابت ہو گیا کہ اس کا عمل ایسا ہی کچھ رہا ہے تو رضائے الٰہی اس کے لیے اپنی آغوش کھول دے گی اور آخرت کی فلاح سے وہ بہر حال شاد کام ہو کر رہے گا۔ اس لیے اس نے جب دنیا میں اس کوشش کا حق ادا کر دیا واضح طور پر اپنی زیست کا مقصد اور اپنے ایمان کا بنیادی تقاضا پورا کر گیا۔ تو اپنی زیست کے اصل مقصد اور اپنے ایمان کے بنیادی تقاضے کو پورا کر دینے کے سوا بھی کوئی چیز ہے جس کی تعبیر کے لیے کامیابی اور بامرادی کے الفاظ محفوظ کر لیے جانے چاہیں؟

ہاں اس راہ میں ایک ناکامی ضرور ہے وہ یہ کہ اپنی قوتوں کو اس میں خرچ کرنے سے دریغ کیا جائے اور اپنی استطاعت کے مطابق کلمہ حق کی سربلندی میں سعی نہ کی جائے اس کے علاوہ اس میں کسی ناکامی کا کوئی خدشہ ہی نہیں۔ مومن اپنی قوتیں میدان سعی وجہد میں ڈال دینے کے بعد جس انجام سے بھی دوچار ہوتا ہے وہ بہر حال کامرانی کا انجام ہے۔ مایوسی و نافرادی کے نام سے بھی اس کی جدوجہد آشنا نہیں۔

کامیابی کا اسلامی تصور

اس بارے میں جو چیز مسلمانوں کی نگاہوں کا حجاب بن گئی ہے وہ دراصل اشیاء کی قدریں متعین کرنے کا وہ مادی اصول ہے جو آج ہر طرف ذہنوں پر چھایا ہوا ہے۔ لیکن جس کو قرآن مٹانا چاہتا ہے آج مسلمان بھی کسی چیز کے رد و قبول میں اسی دنیا میں ظاہر ہونے والے نتائج کو اسی زندگی کے نفع و نقصان کو سامنے رکھنے لگا ہے، اسی لیے وہ اس کوشش کو لاحاصل اور ناکام سمجھتا ہے جس کا کوئی فوری اور مادی فائدہ ظاہر ہوتا ہوا دکھائی نہ دے۔ حالانکہ قرآن نے اسے ترک و اختیار کی بنیاد اور کامیابی کا مفہوم کچھ اور ہی بتایا ہے۔ اس کے نزدیک مسلمان کی پہچان ہی یہ تھی کہ وہ آخرت کے مفاد کو دنیا کے مفاد پر ترجیح دینے والا ہوتا ہے اور اپنی کامیابی صرف اس بات میں سمجھتا ہے کہ اپنی ساری پونجی قیام حق کی راہ میں لگا دے۔ اس کے بعد اگر وہ پہلے ہی قدم پر اپنا سب کچھ کھو بیٹھتا ہے تو بھی اگر سارے عالم پر دین حق کا جھنڈا لہرا دیتا ہے تب بھی، ہر حال میں کامیاب ہی کامیاب ہے۔

ضرورت ہو تو قرآن کی واضح شہادت بھی سن لیجیے۔

منافقوں کی تمنا بھی تھی اور توقع بھی کہ اب جو روم کے افق سے طوفان جنگ نمودار ہو رہا ہے وہ ان مٹھی بھر سر پھرے مسلمانوں کو جو تمام دنیا کو دشمن بنائے بیٹھے ہیں پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور ان کے پرخچے اڑا کر رکھ دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ کو حکم دیا کہ :۔

قل هل تربصون بنا الا احدى الحسنين (توبہ)

(ان منافقوں سے) کہہ دو کہ تم ہمارے حق میں جس بات کا انتظار کرتے ہو وہ ہمارے لیے دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی ہی تو ہے۔"

یہ آیت جو کچھ کہہ رہی ہے اسے غور سے سن رکھیے۔ وہ صاف اعلان کر رہی ہے کہ جس طرح مسلمانوں کا میدان جنگ جیت جانا ان کے لیے بھلائی اور کامیابی ہے اسی طرح ان کا ہار جانا اور جان بحق ہو جانا بھی بھلائی اور کامیابی ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی فتح بھی "حسنیٰ" ہے اور ان کی شکست بھی۔ گویا ایک مرد مومن جب جہاد فی سبیل اللہ کے لیے گھر سے نکلتا ہے تو ہر صورت میں تمغہ کامرانی ہی لے کر لوٹتا ہے بے شک یہ کامیابی بہت بڑی کامیابی ہے۔ کہ وہ اپنی تلوار سے دشمنوں کو زیر کرلے اور حق کا بول بالا کر دے، لیکن دوسری صورت حال کو بھی ناکامی نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ اگر وہ اور اس کے تمام ساتھی خدانخواستہ لڑائی میں قتل ہو جائیں تو ایک مومن کے حقیقی مطمع نظر کے لحاظ سے یہ بھی اسی کے ہم پلہ ایک کامیابی ہے قابل صدر شک کامیابی، ایسی کامیابی جس پر دنیا کی ساری کامیابیاں قربان ہو جائیں۔ جس سے بڑی کامیابی کی آرزو ہی نہیں کی جاسکتی۔

یہ ایک جزئی مثال تھی جس کا تعلق مومن کی ایمانی زندگی کے صرف ایک مخصوص گوشہ سے ہے۔ اسی جزو سے کل کی طرف آیئے اور اسی فرع کو اصل بنا کر مومن کی پوری ایمانی زندگی .... اقامت دین کی جدوجہد .... پر پھیلا دیجیے۔ پھر معلوم ہوگا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام، جن کو اسی جدوجہد کے جرم میں دار پر لٹکا دیا گیا تھا اور جو ایک بالشت زمین پر بھی دین حق کا نفاذ نہ کر سکے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں

ٹھیک اسی طرح دنیا سے کامران و بامراد تشریف لے گئے جس طرح کہ محمد رسول اللہ ﷺ، جنھوں نے ایک وسیع خطہ ارض پر عملاً اللہ کا دین قائم کر دیا تھا مگر اس کھلے راز کو بھی سمجھنے اور قبول کرنے کے لیے مومن کا دل چاہیے۔ عقل مصلحت پرست کے اندر یہ جذباتی باتیں کہاں سما سکتی ہیں؟

عملاً قیام دین کے روشن امکانات

لیکن کامیابی کا جو مفہوم عام طور پر لیا جاتا ہے اس کے لحاظ سے بھی یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ آج کی دنیا میں اس جدوجہد کی ناکامی کی بہ نسبت اس کی کامیابی کا امکان زیادہ ہے۔ اگر امت مسلمہ کا دسواں بیسواں حصہ بھی اپنے اس فریضے کی انجام دہی میں دل و جان سے لگ جائے اور ٹھیک اسی طریقے سے لگ جائے، جس کا اس کا مزاج تقاضا کرتا ہے اور جس کی کتاب و سنت اور اسوۂ انبیاء سے ہدایت ملتی ہے تو اس کوشش کا بارآور ہونا اسی طرح یقینی ہے جس طرح اندھیری رات کے بعد چمکتے ہوئے سورج کا نکلنا یقینی ہوتا ہے۔ اس دعوے کی حقانیت آپ پر بڑی آسانی سے واضح ہو جائے گی اگر ان چیزوں پر اور ان کے تقاضوں پر اچھی طرح غور کر لیں:

۱۔ اقامت دین کے مخاطب اور ذمے دار گروہ کی خاص نوعیت

۲۔ انسانی فطرت کی اصل پسند۔

۳۔ انسان کی موجودہ فکری، عملی اور تمدنی ارتقاء اور اس کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنی بے چینی۔

عموماً لوگ کامیابی کے امکانات کا اندازہ لگاتے وقت پہلے ہی قدم پر ایک عظیم الشان حقیقت فراموش کر جاتے ہیں اور وہ یہ کہ یہ کام کسی بے اصول، خود غرض، تھڑولے اور پست نظر گروہ کے سپرد نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کے سپرد ہے جو مومن ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ یعنی جو قرآنی بیان کے مطابق ایک خدا پر ایمان رکھنے والے ہوتے ہیں اور اس کے سوا کسی کو پرستش اور رضا جوئی کا حق دار حقیقی اطاعت کا سزاوار اور طاقت و اقتدار کا مالک نہیں سمجھتے۔ جو محمد ﷺ کو اپنا ہادی مانتے ہوں اور اپنی زندگی کے کسی شعبے میں ان کے سوا کسی کو قابل اتباع نہیں تسلیم کرتے۔ جو آخرت کو دنیا پر ہمیشہ مقدم رکھتے ہیں جو نماز، روزے اور حج و زکوٰۃ وغیرہ عبادات کے بجالانے والے ہیں۔ جو حق کے شاہد، سچائی کے مجاہد، معروف کے مبلغ، عدل کے علمبردار، باطل کے حریف، منکر کے فطری دشمن، جھوٹ سے متنفر اور ظلم سے مجتنب ہوتے ہیں۔ جن کی پہچان یہ ہے کہ وہ برائی کو نیکی سے اور جہالت کو شرافت سے مٹائیں۔ جن کا شعار یہ ہے کہ وہ انصاف پر قائم رہیں اگرچہ اس کی زد خود ان کے اپنے ہی اوپر کیوں نہ پڑتی ہو۔ جن کا شیوہ یہ ہے کہ دشمن کے ساتھ بھی زیادتی کا سلوک نہ کریں۔ اگرچہ کتنے ہی مظالم ان کے ہاتھوں جھیل چکے ہوں۔ جو ہر حال میں اپنی راستی پر قائم رہتے ہیں۔ اگرچہ دنیا ہاتھ سے نکلی جاتی ہو جو دوسروں کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے اور دوسروں کی جان اور مال کی حرمت کو کعبہ کا مستحق باور کرتے ہیں۔ جو غیر کے لیے بھی وہی پسند کرتے ہیں جو اپنے لیے کرتے ہیں۔ جو خود ننگے اور بھوکے رہ کر غریبوں کو کھلانے پلانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ جن کے دامن یتیموں، بیواؤں اور کمزوروں کے لیے امن و سلامتی کی پناہ گاہیں ہوتی ہیں۔ اب اگر دنیا میں "مومنوں" کا کوئی گروہ موجود ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کسی نہ کسی حد تک یہ صفات بھی اپنے اندر ضرور رکھتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ جب قیام دین کے امکانات کا جائزہ لیا جائے تو اسی گروہ اور اس کی انہی صفات کو سامنے رکھ کر لیا جائے۔ یہ نکتہ اگر نظر انداز ہو گیا تو ہرگز صحیح نتیجے پر نہیں پہنچا جاسکتا۔ اور اگر یہ نظروں کے سامنے رہا تو کوئی وجہ نہیں کہ "ناممکن" کا لفظ پھر بھی منہ سے نکل سکے۔ غور تو کیجیے جو گروہ ایسے ایمانی اور اخلاقی اسلحوں سے مسلح ہو اس کے بارے میں یہ بدگمانی اور مایوسی کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ اللہ کے دین کو قائم کر ہی نہیں سکتا؟ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ اس کی عددی کثرت بھی غیر معمولی حد تک زیادہ ہو اور دنیا کی کسی اور پارٹی کے ممبروں کی تعداد اس کی آدھی تہائی بھی نہ ہو؟ یہ صحیح ہے کہ یہ بھاری گروہ جن افراد پر مشتمل ہے ان کی بہت بڑی اکثریت ان مذکورہ بالا صفات سے تہی دامن ہو چکی ہے۔ مگر یہ کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ اس گروہ میں ایسے لوگ باقی ہی نہیں

رہے جن میں یہ صفات موجود ہوں، نہیں ایسے لوگ اب بھی نایاب نہیں ہیں۔البتہ کمیاب ضرور ہیں۔اگر خاکستر کی ان چنگاریوں کو دنیا میں اجالا پھیلانے کا خیال اور بھڑکانے کا ڈھنگ آجائے تو یہ اندھیرے سنسار کو ایک دن جگمگا کر دم لیں گی۔

اب انسانی فطرت کو لیجیے۔انسان اپنی اصل فطرت کے اعتبار سے خیر پسند ہے اور ایک قلیل تعداد کو چھوڑ کر عام افراد انسانی نیکی کی مقناطیسیت سے کھنچ اٹھنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔خالص باطل پرست اور شر پسند لوگ جو اس حالت کو دراصل اپنی فطرت کو مسخ کر لینے سے پہنچ جاتے ہیں دنیا میں بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔البتہ جب یہی گنتی کے شیطان انسانی زندگی کی اجتماعی مشینری پر قابض ہو جاتے ہیں او قوموں کی زمام قیادت ان کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے تو عام لوگ محض ان کے پیچھے چل پڑنے کی وجہ سے برائی کی نجاستوں سے لتھڑ جاتے ہیں۔مگر اس کے باوجود خیر پسندی کا فطری ذوق ان کے اندر سے فنا نہیں ہو جاتا۔اس لیے اگر نظری اور علمی دونوں طریقوں سے نور حق ان کے سامنے بے حجاب کر کے چمکایا جائے تو ان میں سے کچھ تو اس کی طرف عملاً بھی لپک پڑیں گے اور دوسروں میں اگر اتنی جرأت نہ ہو گی تو اتنا ضرور ہی ہو گا کہ وہ اسے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیں گے۔کوئی وجہ نہیں کہ عام انسان اس چیز کو اس کی اپنی صحیح شکل میں دیکھ لینے کے بعد بھی رد کر دے، جو اس کی فطرت کو مطلوب ہے اور اس چیز سے بدستور لپٹا رہے جس سے اس کی اصل فطرت ہم آہنگ نہیں۔

آخری قابل لحاظ چیز جسے اس سلسلے میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔زمانے کا ارتقائی رجحان اور انسان کی ذہنی بے چینی ہے۔پچھلے زمانوں میں ایک تو انسانی فکر اپنی پختگی کو پہنچی نہیں تھی۔دوسرے لوگوں میں گروہی اور مذہبی عصبیتیں حد سے زیادہ ہوتی تھیں اور وہ اپنے دلوں کے دروازے بیرونی آواز کے لیے مضبوطی سے بند رکھتے تھے۔تیسرے تبلیغ واشاعت کے ذرائع نہایت محدود تھے۔ان اسباب کی بنا پر دین حق کی تبلیغ کے ظاہری نتائج اکثر ناکامی کی شکل میں نمودار ہوا کرتے تھے۔مگر اب حالات بالکل بدلے ہوئے ہیں۔انسان تحکمی عقائد کی اندھی پیروی اور اوہام پرستی سے اور اونچا اٹھ رہا ہے اور روز بروز حقائق پسندی کی طرف آرہا ہے۔عقلیں ان اصول و نظریات کو چھانٹ کر دور پھینکتی جارہی ہیں جو انسانی زندگی کے مسائل کو تسلی بخش طور پر حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔مغربی تہذیب نے جہاں دنیا کو بے شمار نقصانات پہنچائے ہیں وہی وہ ایک ایسی کیفیت بھی ذہنوں میں پیدا کر گئی ہے جس سے ایک ایسا دین عظیم الشان فائدے حاصل کر سکتا ہے جو مسائل زندگی کا صحیح، متوازن اور اطمینان بخش حل پیش کر سکے۔اس تہذیب نے ان اوہام کی بہت کچھ بنیاد ڈھا دی ہے جو انسانی دماغ کا پردہ بنے ہوئے تھے، ان اوہام کے ڈھ جانے کے ساتھ ہی ان مذاہب کی چھتیں بھی زمین پر آگئی ہیں جن کی تعمیر ان اوہام پر ہوئی تھی اور جو صرف جذباتی عصبیتوں کے حصار ہی میں جی سکتے تھے۔اس تہذیب کا جنم دراصل ایک فکری انقلاب کا نتیجہ تھا ایک تو انقلاب کی فطرت ہی بحرانی ہوتی ہے۔دوسرے جہاں تک خاص اس انقلاب کا تعلق ہے تو اسے صحیح رخ پر موڑنے کی کوئی کوشش بھی نہ ہوئی۔بلکہ اس کا راستہ روکا گیا اور وہ بھی نہایت بھونڈے بلکہ احمقانہ طریقے سے۔اس لیے وہ اپنے جوش میں اوہام کے ساتھ بہت سے حقائق بھی جہالے گیا اور دیگر مذاہب کی طرح خود اسلام کو بھی چیلنج کر گیا جو اپنی فطرت اور عقلیت کی وجہ سے اس کا صحیح رہنما ہو سکتا تھا۔مگر اس بے اعتدال کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں مختصر یہ کہ اس انقلاب نے ذہنوں میں جو بھونچال پیدا کر دیا ہے اس نے جاہلانہ مذہبی عصبیتوں کی بندش بڑی حد تک ڈھیلی کر دی ہیں اور ایسے بے شمار افراد پیدا کر دیے ہیں جو کسی بات کو صحیح سمجھ لینے کے بعد اسے تسلیم کر لینے میں اپنی روایتی معتقدات کو مانع نہیں پاتے۔پھر فکر کی اس آزادی اور ذہن کی اس بے تعصبی کے علاوہ وقت کے تمدنی، معاشی اور سیاسی حالات نے بھی اسلام کے لیے کچھ زمین ہموار کر دی ہے۔جب سے نظام عالم کی سیاسی باگ دوڑ فاسق وفاجر اور خدا سے باغی ہاتھوں میں آئی ہے اور انہوں نے ہدایت الٰہی کو پس پشت ڈال کر زندگی کے نظام کو اپنے من مانے اصولوں پر چلانا شروع کیا ہے اس وقت سے نوع انسان برابر اپنی خود سری کے برے نتائج بھگتتی چلی آرہی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ انسانی دماغ کے بنائے ہوئے تمام نظام ہائے زندگی ایک ایک کر کے ناکام ثابت ہو چکے ہیں نہ صرف یہ کہ ناکام ثابت

ہو چکے ہیں۔ بلکہ ان کی پیدا کی ہوئی پیچیدگیوں اور ان کی نازل کی ہوئی بلاکتوں سے دنیائے انسانیت چیخ اٹھی ہے اور بڑی بے تابی سے ایک ایسے نظامِ حیات کی فی الواقع طلب گار ہے جو اس کے دکھوں کا مداوا ہو سکے۔

صورت واقعہ کے ان تینوں روشن پہلوؤں کو نگاہ میں رکھیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ دین کا قیام ممکن ہے یا ناممکن؟ کیا یہ صورت واقعہ ڈرنے، سہمنے، اور مایوس ہونے کی ہے؟ اگر نہیں، تو وہ لوگ کیوں نہ پورے اعتماد اور حوصلے کے ساتھ آگے بڑھیں۔ جو ایک طرف تو اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ پورا حق صرف اسلام کے پاس ہے اور زندگی کے مسائل کا صحیح اور تسلی بخش حل اس کے سوا اور کہیں ہے ہی نہیں۔ دوسری طرف انہیں اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ انسان بھلائی کا فطری طلب گار اور خدا کی بہترین مخلوق ہے۔ پیدائشی مجرم اور بدی کا پجاری نہیں ہے۔ البتہ ان لوگوں سے اس طرح کے کسی اقدام کی توقع رکھنا ضرور غلط ہوگا جن کے اندر کا یہ یقین رسمی عقیدے کی حدوں سے آگے نہ بڑھا ہو۔ کیونکہ ایسے "کامل ایمان" خواہ اسلام کے ان فضائل و محامد کا کیسے ہی فخر اور جوش سے اظہار کرتے ہوں۔ اور اس کی شان میں کیسے ہی عمدہ قصیدہ پڑھتے ہوں مگر چونکہ ان کی مدح سرائیوں کی جڑیں دل کی گہرائیوں میں نہیں ہوتیں اس لیے وہ عمل واقدام کے پھل بھی نہیں دے سکتیں۔ ایسے لوگ اگر خدا کے دین سے مایوس ہوں تو انہیں مایوس ہانا چاہیے اور خود یہ دین بھی ان سے مایوس ہی ہے مگر ان لوگوں کے لیے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں جو دین حق کی ان خوبیوں اور صلاحیتوں پر اپنی عقل اور بصیرت کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں اور اگر نہیں جانتے تو انہیں جاننا چاہیے کہ دنیا کے عام حالات اور انسانی حقائق آج اسلام کے حق میں ہیں۔ آگے ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ جو فکری اور عملی طاقت انہیں حاصل ہے اسے وہ اسی کام پر مرکوز کر دیں کہ یہ دنیا اسباب کی دنیا ہے۔ یہاں جو کام بھی انجام پاتا ہے اپنے مقررہ طرز ہی پر انجام پاتا ہے۔ آپ کے اپنے دستر خوان کا لقمہ بھی آپ کے منہ میں نہیں پہنچ سکتا۔ جب تک اس کے لیے آپ اپنے ہاتھ کو حرکت نہیں دیتے اس لیے حالات کسی نصب العین کے حق میں کیسے ہی سازگار کیوں نہ ہوں، وہ کامیابی کی منزل پر اس وقت تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا، جب تک کہ اس کے لیے ضروری تدبیر اور مطلوبہ کوششیں زیر عمل نہ لائی جا چکیں۔ اقامت دین...................... کا نصب العین بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے اس لیے ان تمام روشن پہلوؤں کے باوجود جن کا ابھی تذکرہ کیا جا چکا ہے اس مقصد میں کامیابی اسی وقت ہو سکے گی جب کہ اس کے لیے مناسب تدبیریں اور مطلوبہ کوششیں اختیار کر لی جائیں۔

یہ تدبیریں اور کوششیں کیا ہیں؟ ان کو دو لفظوں میں اسلام کی "فکری اور عملی" شہادت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

فکری شہادت تو یہ ہے کہ اسلام کا بیسویں صدی کی زبان میں تعارف کرایا جائے اور آج کے ذوق و ذہن کو اپیل کرنے والے طرز استدلال سے اس مدلل کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اس نے جو ہدایات و احکام دیئے ہیں انہیں زمانہ حال کی تعبیروں میں ڈھال کر لوگوں پر واضح کر دیا جائے کہ انسانی مسائل کا صحیح حل اور تمدن عالم کی صحیح رہنمائی صرف انہی ہدایت میں مضمر ہے۔

عملی شہادت یہ ہے کہ عمل کی زبان سے بھی اس پر اپنے یقین کا اظہار کیا جائے اور مشکل سے مشکل مواقع میں بھی اس کی راہ راست سے قدموں کو ہٹنے نہ دیا جائے، اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق مضبوط سے مضبوط تر کیا جائے۔ عبادتوں میں وہ روح پیدا کی جائے جس سے دلوں میں زندگی اور سیرتوں میں پاکیزگی آتی جائے۔ انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کے معاملات میں اسلامی اخلاق کی پوری پابندی کی جائے۔ قومی، وطنی، نسلی، خاندانی، طبقاتی اور ذاتی مفادات سے آنکھیں بند کر کے اصلاً صرف اسلام کے مفاد کو سامنے رکھا جائے ظلم کا جواب عدل اور عفو و در گزر سے، بدی کا جواب نیکی سے، جھوٹ کا جواب سچ سے اور بے اصولی کا جواب اصول پسندی سے دیا جائے کہ یہ سعی و جہد صرف اس مسلکِ حیات کی تبلیغ و اقامت کے لیے ہے جس پر ساری انسانیت کی فلاح موقوف ہے۔ اور پھر اس سعی و جہد میں حسب ضرورت اپنے عیش و آرام کو خیر باد کہنے، اپنی آرزوؤں کو پامال کرنے اور جانی و مالی قربانیاں دینے میں کم از کم اتنی ہی پامردی دکھائی جائے، جتنی کہ لینن اور اسٹالن کے ساتھیوں نے کیمونزم کی اقامت میں، نازیوں نے نازیت کی حمایت و سربلندی میں اور جاپانیوں نے میکاؤو کی رضاجوئی میں ابھی پچھلے دنوں دکھائی ہے۔

اگر فکری اور عملی شہادت کا یہ فریضہ انجام دے دیا گیا..................... جو دیا یقیناً جا سکتا ہے.................. تو حق کی ساحرانہ قوت تسخیر کا دعویٰ ہے اور خدا کی سنت اس دعویٰ کی گواہ ہے کہ ایک دن یہ جدوجہد کامیاب ہو کر رہے گی۔ ذہنوں کی گرہیں کھل جائیں گی دل اس کی طرف کھنچے آئیں گے آنکھیں اس کے سامنے فرط عقیدت سے جھک پڑیں گی اور دنیا پھر سے **یدخلون فی دین اللہ افواجاً** کا روح پرور منظر دیکھ لے گی۔

ہم جانتے ہیں کہ آج خدا کی زمین پر باطل کی مضبوط گرفت قائم ہے مگر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ باطل اپنے ابدی اقتدار کا وثیقہ لے کر نہیں آیا ہے نہ وہ اس زمین کا جائز وارث ہے۔ قدرت نے زمیں کو اصل مسکن حق کا بنایا ہے باطل کا نہیں۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ جب حق اپنے علمبرداروں کی غفلت اور فرض ناشناسی کی وجہ سے اپنے اس گھر کو چھوڑ دیتا ہے تو باطل کا دیو اسے خالی پا کر قبضہ جما لیتا ہے۔ کیونکہ اس گھر کے بنانے والے نے اس کے لیے ضابطہ ہی یہ بنایا ہے کہ وہ کبھی بے آباد نہ رہے۔ اس لیے اگر وہ اپنے اصل حق دار سے آباد نہیں رہ جاتا تو ناچار غاصب ہی کے لیے اپنے دروازے کھول دیتا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ ایک غیر فطری صورت حال ہوتی ہے جسے یہ گھر مجبوراً ہی گوارا کرتا رہتا ہے اس لیے جب بھی اس کا اصل مکین اپنا قبضہ واپس لینے پر تل جاتا ہے تو قدرت کے مضبوط ہاتھ اس غاصب کو نکال کر لازماً باہر کر دیتے ہیں یہ ایک اصولی حقیقت ہے جس کی بنیاد کسی خوش گمانی پر نہیں بلکہ قرآن حکیم کے محکم بیان پر ہے اس نے فرمایا ہے:

جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقاً (بنی اسرائیل: ۸۱)

"حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، بلاشبہ باطل مٹنے ہی والی چیز ہے۔"

معلوم ہوا ہے کہ باطل کی زندگی صرف حق کی غیر موجودگی تک ہے۔ جب حق آئے گا..................... آئے گا نہیں بلکہ یوں کہیے کہ جب لانے والے اسے لائیں گے تو باطل خود جگہ چھوڑ دے گا اس لیے یہ گمان کرنا کہ مطلوبہ کوششوں کے باوجود حق کا قیام ممکن نہیں دراصل اللہ تعالیٰ پر بے اعتمادی کا اظہار کرنا اور عہد شکنی کا بہتان لگانا ہے، جو خدا اس باطل کی خاطر دی جائی قربانیوں کو بھی کامیاب بنا دیتا ہے، جو اسے مبغوض ہے، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ اس حق کی خاطر دی ہوئی قربانیوں کو رائیگاں جانے دے گا جو اس کو محبوب ہے۔ حالانکہ اس کی طرف سے وعدے پر وعدے بھی کئے گئے ہیں کہ:

ولینصرن اللہ من ینصرہ (حج: ۴۰)

"اللہ ان لوگوں کی ضرور مدد کرتا ہے جو اس (کے دین) کی مدد کرتے ہیں۔"

من یتق اللہ یجعل لہ من امرہ یسراً (طلاق: ۴۰)

"جو خدا ترسی کی روش اختیار کرتا ہے تو خدا اس کے کام میں اس کے لیے آسانی فراہم کر دیتا ہے۔"

و من یتق اللہ یجعل لہ مخرجاً و یرزقہ من حیث لا یحتسب و من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ (طلاق: ۲، ۳)

"جو کوئی خدا ترسی کی راہ پر چلتا ہے وہ اس کو راستہ مہیا کر دیتا ہے۔ اور اسے وہاں سے روزی دیتا ہے جہاں سے اسے روزی ملنے کا شان و گمان بھی نہیں ہوتا، اور جو اللہ پر بھروسہ رکھتا ہے تو وہ اس کے لیے کافی (ثابت) ہوتا ہے۔

اور اسی لیے اس سعی و جہد کے نتیجے میں اس نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ:

الا ان حزب اللہ ھم الغالبون (مائدہ: ۵۶)

"سن رکھو! اللہ کی پارٹی ہی غالب رہنے والی ہے۔"

نیز اس نے یہ بات بھی فرمار کھی ہے اور کسی اشارے کنائے کے انداز میں نہیں، بلکہ صریح لفظوں میں فرمار کھی ہے کہ جب یہ پارٹی دشمن کے مقابل ہوتی ہے تو اس کی غیبی نصرتیں اس کی پشت پر ہوتی ہیں یہاں تک کہ آسمان کے فرشتے بھی اس کے پہلو بہ پہلو لڑنے کے لیے اتر آتے ہیں اور اس لیے وہ اپنے سے دس گنے دشمنوں پر بھی غالب آکر رہتی ہے۔ بدر، احزاب، اور حنین کی لڑائیوں میں وعدے واقعہ بن چکے ہیں۔ لہٰذا یقین رکھنا چاہیے کہ جو فرشتے ان میدانوں میں آئے تھے وہ کہیں بھی آسکتے ہیں اور قرآن بتاتا ہے کہ خدا کے بندے اور حق کے مجاہد جب چاہیں انہیں بلا سکتے ہیں۔ چنانچہ غزوۂ بدر کے واقعات پر تبصرہ کرتے وقت جب اللہ نے ملائکہ کے اترنے کا ذکر کر کے اپنی غیر معمولی نصرت فرمائی کا تذکرہ کیا تو ساتھ ہی اس خیال کو بھی دور کر دیا کہ ممکن ہے یہ نصرت کوئی وقتی قسم کی اور صرف اسی ایک واقعہ کے لیے رہی ہو........................ فرمایا:

وما النصر الہ من عند اللہ (انفال)

"یہ مدد خاص اللہ ہی کی جناب سے ہوتی ہے۔"

فرمانے کا مدعا یہ ہے کہ فتح و نصرت خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ جس طرح آج ہے کل بھی رہے گی۔ اس لیے اہل ایمان کو یہ تائید و نصرت حاصل ہو سکتی ہے اور اگر انہوں نے "انصار اللہ" ہونے کا حق ادا کر دیا تو اللہ تعالیٰ بھی ان کا "مولیٰ اور نصیر" بننے میں دیر نہ لگائے گا۔

یاد رکھیے! یہ سب وعدے اور ارشادات اس اللہ کے ہیں جس کے بارے میں مومن کا یہ یقین ہے کہ وہ کبھی غلط وعدہ نہیں کرتا اور جو وعدہ کرتا ہے اسے ضرور پورا کرتا ہے اور اگر کوئی اس یقین سے محروم ہے تو وہ مومن ہی نہیں................. جھوٹ کہتا ہے اگر اپنے آپ کو مومن کہتا ہے۔ حتیٰ کہ غلط نہ ہوگا اگر اسے انہی پیش رووں کا "خلف الصدق" کہا جائے جو دین کی راہ میں مشکلات کو دیکھ کر بول اٹھتے تھے کہ اللہ ہم سے فتح اور غلبے کے وعدے کر کے دراصل دھوکہ دے رہا ہے۔ (**ما وعدنا اللہ و رسولہ الا غروراً**۔ احزاب: ١٢)

107 کیا ان تمام حقیقتوں کے باوجود دین کے قیام کو ناممکن ہی کہا جاتا رہے گا اور کیا ایسا کہنا قلب و نظر کی بے بصیرتی یا پھر ادائے فرض سے بزدلانہ فرار کی دلیل نہیں؟ امکان کامیابی کے ان تمام روشن پہلوؤں کی موجودگی میں بھی اگر کوئی شخص قیام دین کی طرف سے مایوس ہی رہتا ہے تو یقیناً وہ مومن کا کردار ادا کرتا ہے نہ مومنانہ ذہن کا ثبوت دیتا ہے وہ بھولتا ہے کہ مایوسی ایمان کے نہیں بلکہ کفر کے خصائص میں سے ہے۔ ایسے لوگ حالات کی نام نہاد ناسازگاریوں کو دراصل اپنی فراری روش کا جواز ثابت کرنے کے لیے بہانہ کے طور پر استعمال کیا کرتے ہیں ورنہ انہیں بتانا چاہیے کہ آخر وہ کون سے حالات ہیں جن میں دین اللہ کا قیام و نفاذ ممکن ہوا کرتا ہے؟ یہ تو بالکل ظاہر بات ہے کہ دین حق کو قائم کرنے کی کوشش جہاں بھی اور جس وقت بھی درکار ہوگی وہاں اور اس وقت کوئی نہ کوئی دین باطل بالفعل قائم اور نافذ ضرور ہوگا۔ اس لیے معلوم ہونا چاہیے کہ باطل نظاموں میں سے وہ کون سا نظام "شریف" نظام ہے جو نظام حق کے قیام و نفاذ کے لیے اپنی مملکت از خود چھوڑ دیا کرتا ہے تاکہ اس کی آمد کا انتظار کیا جائے اور جب وہ آکر نظام حق کی تاجپوشی کے لیے دربار حکومت بنا سجا دیں۔ کیا یہ دنیا کی پوری زندگی میں اس طرح کا کوئی حق نواز باطل کبھی پایا گیا ہے؟ اور کیا دین حق کی امامت کے لیے جب جب کوششیں کی گئی ہیں اس وقت کے حالات اس کام کے لیے ضرور ہی سازگار تھے؟ اور آئندہ ہمیں بھی ایسے خوش آئند حالات پیدا ہو جانے کی امید ہے؟ مستقبل کے پردے میں کیا کچھ چھپا ہوا ہے اس کا علم تو خدا ہی کو ہے۔ مگر ماضی کے حالات اور واقعات کے آئینے میں تو صورت واقعہ کا مشاہدہ ہم بھی کر سکتے ہیں ان حالات اور واقعات کا گہری نظر سے جائزہ لیجیے۔ پھر بتائیے کہ دینی تاریخ کے اس پورے سلسلے میں، جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر ہم تک پہنچا ہے۔ اقامت دین کے لیے جتنی کوششیں کی جا چکی ہیں کیا ان سب کے زمانے اس کام کے لیے آج کی بہ نسبت لازماً زیادہ سازگار تھے؟ اس کے ثبوت میں کیا حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے کا نام لیا جا سکتا ہے جب کہ ساڑھے نو سو برس تک ان پر گالیوں اور پتھروں کی بارش ہی ہوتی رہی تھی؟ یا کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کا حوالہ دیا جا سکتا ہے، جب کہ نمرود کی "خدائی" قائم تھی اور حضرت ممدوح کو آخر کار انگاروں کی بھٹی میں جھونک دیا گیا تھا یا کیا حضرت عیسیٰؑ کا زمانہ اس خیال کی شہادت بن سکتا ہے۔ جس

میں چاروں طرف رومن ایمپائر کی طاغوتیت چھائی ہوئی تھی اور چند برسوں کے اندر ہی اندر انہیں پھانسی کا حکم سنناپڑ گیا؟ پھر کیا پیغمبر آخر الزماںﷺ کا زمانہ اس نقطہ نظر کے حق میں پیش کیا جاسکتا ہے جب کہ خود مرکز توحید تین سو ساٹھ بتوں کا گڑھ اور جاہلیت کی راجدھانی بنا ہوا تھا، اور دعوت حق کا جواب دل آزاریوں اور ایذار سانیوں، کانٹوں اور پتھروں، سماجی بائی کاٹ اور قتل کے منصوبوں سے دیا جاتا تھا.........................

اگر انبیائی دعوتوں کو کسی تاویل سے اپنے لیے ماورائے مثال قرار دے لیا جائے تو اچھاذرا نیچے بھی اتر کر دیکھ لیجیے دیکھیے، یہ مجدد الف ثانی کا زمانہ ہے، اس میں "مسلمان" حکومت اسلام کے خلاف اپنا پورا زور صرف کرتی نظر آرہی ہے اور یہ سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کا زمانہ ہے جس میں اہل اسلام کے سینوں پر ایک طرف انگریز اور دوسری طرف سکھ سوار دکھائی دے رہے ہیں اور داڑھیوں تک پر ٹیکس لگا ہوا ہے نام لے کر بتایئے ان زمانوں میں سے کون سازمانہ ہے جس کو دعوت حق کے لیے موجودہ زمانے سے زیادہ سازگار کہا جاسکتا ہے؟ کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ ان میں سے ہر زمانہ اقامت دین کے لیے اس سے کہیں زیادہ پر خطر اور مایوس کن اور ناسازگار تھا جتنا کہ آج ہے؟ پس اگر ناسازگاریوں کا لحاظ کیا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ آغاز آفرینش سے اب تک ایک فیصدی دور بھی ایسے نہیں آئے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کوئی دور بھی نہیں آیا جو اس جدوجہد کے لیے سازگار تھا مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے سخت زمانوں اور ناموافق حالات میں بھی کتنی ہی کوششیں کامیاب ہو گئیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم نے دنیا جہاں کی ساتی ناکامیاں اس زمانے کے لیے کیوں مقدر مان لی ہیں؟ اور ساری مایوسیوں کو اپنے ہی لیے مخصوص سمجھ لیا ہے؟

مزید ستم ظریفی یہ کہ "ناممکن" ہونے کا یہ فتویٰ بھی کسی عملی تجربے کی سند کے بغیر ہی دیا جارہا ہے۔ جب اس کام کی خاطر کبھی براہ راست کوشش ہم نے کی ہی نہیں۔ تو آخر کس دلیل کی بناپر یہ ناممکن، ناممکن کا شور کیا جارہا ہے؟ اگر ہم نے فکر و عمل کی ساری قوتوں کے ساتھ، اور طریق انبیاء کے مطابق، یہ کوشش کرلی ہوتی اور اس کے بعد بھی ساحل مراد دکھائی نہ دیا ہوتا تو بہر حال یہ ایک تجربہ ہوتا جو عدم امکان کے دعوے کے حق میں بطور دلیل پیش کیا جاسکتا تھا۔ مگر یہ عجیب دھاندلی ہے کہ دریا میں اترتے نہیں اور دور کھڑے کھڑے اس کی گہرائی کے اتھاہ ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں یقین فرمایئے جو ذہنیت آج کے حالات کو ناسازگار کہتی ہے اور ان کی موجودگی میں کامیابی کو ناممکن قرار دے رہی ہے۔ وہ قیامت تک کسی امکان کے پالینے میں ناکام ہی رہے گی۔ اور اس کے لیے کوئی زمانہ ایسا آہی نہیں سکتا، جس میں اس جدوجہد کو شروع کیا جاسکتا ہو، جس باطل سے آج وہ لرزاں ہے وہی ہمیشہ رہے گا۔ صرف اس کی شکلیں بدلتی رہیں گی۔ مگر قیام حق کے مقابلے میں ہر باطل ہی ہے وہ اپنے کسی دور اور اپنی کسی شکل میں بھی حق کو زندگی کا رہنما سمجھنے کا روادار نہیں ہو سکتا ہے۔ جب بھی اقامت حق کے لیے جدوجہد کی جائے گی وقت کا باطل اپنے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر لازماً سامنے آئے گا اور اہل حق کو مختلف شکلوں میں وہی تمام زحمتیں، رکاوٹیں، مشکلیں اور مصیبتیں استقبال کے لیے موجود ملیں گی جن کا آج تصور کیا جاسکتا ہے، بھولنا نہ چاہیے کہ یہ راہ ہمیشہ خار زاروں اور شعلہ کدوں ہی سے گزرے گی۔ وہ امکان اور وہ سازگاری، جس کی تلاش ہے اس راہ کے مسافروں کو نہ کبھی ملی ہے نہ مل سکتی ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو اتنی وضاحت سے بیان کر دیا ہے کہ غلط فہمی یا خوش گمانی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے وہ بار بار فرما چکا ہے کہ ایمان کو طرح طرح کی آزمائشوں سے جانچا پرکھا جاتا ہے اور اللہ کے حضور وہ اس وقت تک مقبول نہیں ٹھیرتا جب تک کہ وہ اس بھٹی میں تپائے جانے کے بعد اپنے کو کھرا نہ ثابت کر دے۔ حتیٰ کہ حالات اگر بظاہر بالکل سازگار اور بے خطر دکھائی دیتے ہوں تو بھی قدرت انہیں حقیقت کے ہوتے ہوئے اس منطق کی داد بھلا کون دے سکتا ہے کہ حالات سخت ناسازگار ہیں اور فضا خطرات سے بھری ہوئی ہے اس لیے دین کی اقامت کا نام لینا صحیح نہیں.....................قرآن حکیم کے نزدیک تو مشکلات اور مصائب کے ذریعے دعوائے ایمان کی آزمائش ضروری ہے لیکن اس کے ماننے والوں کا حال یہ ہے کہ وہ آزمائش ضروری ہے لیکن اس کے ماننے والوں کا حال یہ ہے کہ وہ آزمائش میں کامیاب ہو کر اپنے مومن ہونے کا ثبوت پیش کرنے کے بجائے اسے الٹا اپنے ادائے فرض سے سبکدوش ہونے کی سند جواز بنائے لے رہے ہیں، یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ فوج کا کوئی سپاہی میدان جنگ کا رخ کرنے سے اس لیے انکار کر دے کہ وہاں سے توپوں کے چھوٹنے اور بموں کے پھٹنے کی دہشت ناک

آوازیں آ رہی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ سمجھے یہی جا رہا ہو کہ مجھے ملک و ملت کا ایک وفادار اور فرض شناس سپاہی کہا جانا اور بہادری کے تمغے کے مستحق تسلیم کیا جانا چاہیے۔ حالانکہ یہ میدان جنگ ہی وہ جگہ ہے جہاں اعزاز کا استحقاق حاصل کیا جا سکتا ہے۔

قومی مفاد کا بت

اس سلسلہ میں قومی مفادات کی دہائی بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں کیونکہ اس "دلیل" کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ جس مسلمان کو ہر حال میں انصاف پر مضبوطی سے قائم رہنے اور اللہ کے لیے حق کی بے لاگ شہادت دینے کی تعلیم دی گئی تھی۔ خواہ اپنی ہی ذات کے لیے اپنے والدین ہی کے یا اپنے اقرباہی کے خلاف صف آرا ہونا پڑ جائے (کونوا قوامین بالقسط) اور جس کے متعلق یہ طے کیا جا چکا ہے کہ اللہ نے اس کے جان و مال کو جنت کے عوض خرید لیا ہے (ان اللہ اشتریٰ الخ) اب اسی مسلمان کو گویا اس بات کی تلقین کی جا رہی ہے کہ اگر انصاف کی راہ پر چلنے اور حق کی شہادت دینے میں تیری ذات کا یا تیرے خاندان کا یا تیری قوم کا نقصان ہوتا ہے تو ایسے انصاف کو دیوار پر دے مار اور ایسی شہادت حق پر لعنت بھیج! اگر اللہ کی رضا جوئی اختیار کرنے سے تیری جان یا تیرے مال پر آنچ آتی ہو تو ایسی خدا طلبی کو دور سے سلام کر! غور تو کیجیے قومی مفاد کی محبت میں اپنے مقصد وجود ہی کو چھوڑ بیٹھنے کا خیال کوئی معمولی خیال ہے یا یہ زندگی کا ایک مستقل بنیادی نظریہ ہے، جس کی اساس پر بننے والی عمارت اس عمارت سے یکسر مختلف ہوتی ہے جس اسلام یا قرآن تعمیر کرنا چاہتا ہے؟ اس نظریے کو اختیار کر لینے والا اگر اپنے کو مسلمان کہتا ہے تو کہے مگر اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ ایک ایسا "مسلمان" ہے جس کی نگاہ میں بنیادی اہمیت دین اور قیام دین کو نہیں بلکہ اس کے اپنے معاشی اور سیاسی مفاد کو حاصل ہے جو ایسا کوئی راستہ اختیار کرنے سے اس کو اپنا یا اپنی قوم کا کوئی مادی مفاد خطرے میں پڑا دکھائی دیتا ہو اور جو دین کو دنیا پر، آجلہ کو عاجلہ پر، معاد کو معاش پر رضائے الٰہی کو قومی مفاد پر یعنی مقصد زندگی کو زندگی پر قربان کر دینے ہی کو دانش مندی سمجھتا ہے۔ کیا اس ذہنیت کو مومنانہ ذہنیت سمجھا جا سکتا ہے؟ کیا یہ وہی انداز فکر ہے جو قرآن کا ہو سکتا ہے تو پھر وہ کون سی ذہنیت اور انداز فکر ہے جو قرآن اپنے پیروؤں کو سکھاتا ہے؟ اگر یہ ذہنیت اور یہ انداز فکر ایک مومن اور پیرو قرآن کا ہو سکتا ہے تو پھر وہ کون سی ذہنیت اور انداز فکر ہے جسے ہم کفر اور مادیت کا مخصوص انداز کہہ سکتے ہیں؟ کیا ہمیں قرآن کی یہ بات یاد نہیں رہی کہ اللہ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں بنائے ہیں" (ما جعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہ (احزاب: ۴) اور جب ہر شخص کے سینے میں دل ایک ہی ہے تو اس میں بیک وقت دو محبوبوں اور دو معبودوں کی گنجائش کہاں سے نکل سکتی ہے۔ اس میں آباد تو صرف ایک ہی کی محبت ہو سکتی ہے، یا خدا کی یا قوم اور قومی مفاد کی اس لیے حضرت مسیحؑ کی زبان میں اسی بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ "آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یا تو ایک سے عداوت رکھے گا اور دوسرے سے محبت، یا ایک سے ملا رہے گا اور دوسرے کو ناچیز جانے گا۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔" (متی باب ۶)

غرض اس نظریئے کے ساتھ خدا پرستی کا جوڑ کبھی نہیں لگ سکتا۔ یہ ایک روشن حقیقت ہے آسمان کے سورج سے زیادہ روشن، اس لیے جس قسم کے مفاد قومی کی دہائی دی جا رہی ہے وہ ایک خطرناک بت ہے جسے توڑے بغیر اسلام کا مفاد پورا نہیں کیا جا سکتا۔

زمانہ نبوت میں بہت سے منافقوں کے نفاق کی بنیاد بھی اسی مفاد پرستانہ ذہنیت پر تھی ایمانی اخلاص کے مطالبے کے جواب میں وہ کہا کرتے تھے کہ:

نخشیٰ ان تصیبنا دائرۃ (مائدہ)

"ہمیں ڈر ہے کہ ہم پر کوئی مصیبت آ جائے گی۔"

یعنی اگر ہم اخلاص کے ساتھ اور بالکل یکسو ہو کر ملت اسلامی میں علانیہ شامل ہو گئے تو ہم کو مصیبتیں گھیر لیں گی۔ ماحول ہمارا دشمن ہو جائے گا اور اسلام کی وجہ سے ہم سارے جہاں کی عداوتوں کا نشانہ بن جائیں گے۔

اسی طرح بہت سے تھڑولے کفار کا بھی یہی کہنا تھا کہ محمد ﷺ! ہم تمہاری تعلیمات کی سچائی سے انکار نہیں کرتے، مگر ہماری مشکل کا کیا علاج کہ:

ان نتبع الھدٰی معك نتخطف من ارضنا (قصص:۵۷)

"اگر ہم آپ کے ساتھ ہدایت الٰہی کے پیرو بن جائیں تو (مادر) وطن (کی گود) سے اچک لیے جائیں گے۔"

یہ دونوں گروہ اتباع حق کے معاملے میں جس انداز فکر اور طرز استدلال سے کام لے رہے تھے کیا آج قومی مفاد کی باتیں انہی کی یاد تازہ نہیں کر رہی ہیں؟ قرآن سراپا حق ہے پیغمبر صادق و مصدوق ﷺ ہے۔ اسلام کی صحیح پیروی ہی فلاح اور خوش بختی کا واحد ذریعہ ہے................. لیکن اگر قرآن کے مطالبے، رسول کی ہدایات اور اسلام کے تقاضوں پر عمل ہوا تو ہم برباد ہو جائیں گے، ہمیں اندیشہ نہیں بلکہ یقین ہے کہ زمانہ بھر کی آفتیں ہم پر ٹوٹ پڑیں گی، ذرہ ذرہ ہماری مخالفت پر کمر باندھ لے گا۔ ہم معاشی غلام اور سیاسی چھوت بن جائیں گے، افسوس! ذرا نہ سوچا گیا کہ یہ قومی مفاد کا بچانا ہے یا اللہ کے غضب کو دعوت دینا؟

صحیح مفادات کے تحفظ کی قطعی ضمانت

یہ جو کچھ عرض کیا گیا، یہ فرض کر کے عرض کیا گیا کہ قومی مفادات کی تباہی کا اندیشہ ایک واقعی اندیشہ ہے لیکن کیا حقیقت بھی اس مفروضے کے مطابق ہی ہے؟ کیا امت اگر دین کی ہو رہی تو دنیا سے فی الواقع اسے ہاتھ دھو ہی لینا پڑے گا۔ قرآن مجید کا کہنا ہے کہ نہیں، ایسا ہر گز نہیں ہے بلکہ حقیقت حال اس کے بالکل بر عکس ہے۔ یعنی اقامت دین کا فریضہ اگر بجالا یا گیا تو اس سے صرف آخرت ہی نہیں سنورے گی بلکہ اس کی دنیا بھی اجلی ہو جائے گی اور کسی ایسی چیز سے محروم نہ رہ جائے گی، جس کی عالی حوصلہ قومیں طلب گار اور آرزومند ہوا کرتی ہیں، چنانچہ وہ ان محبوب و مطلوب چیزوں میں سے ایک ایک چیز کا نام لے کر "باایمان" مومنوں کو اس کے لازمی حصول کی بشارت دیتا ہے مثلاً باعزت امن و اطمینان کی زندگی کے بارے میں جو صحیح قومی مفادات میں سے ایک اہم مفاد ہے، وہ فرماتا ہے:

الذین آمنوا و لم یلبسوا ایمانھم بظلم اولئك لھم الامن (انعام:۸۳)

"جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو شرک سے آلودہ نہیں کیا۔ ان کے لیے امن ہے۔"

اسی طرح معاشی خوشحالی کے متعلق وہ اللہ جل شانہٗ کے یہ ارشادات سناتا ہے کہ:

ولو ان اھل القریٰ آمنوا واتقوا الفسھنا علیھم برکات من السماء و الارض (اعراف:۹۶)

"اگر بستیوں والے ایمان لائے اور تقوی کی راہ چلے ہوتے تو ہم ان پر آسمانوں اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

ولوانھم اقاموا التوراۃ والانجیل وما انزل الیھم من ربھم لاکلوا من فوقھم و من تحت ارجلھم (مائدہ:۶۶)

"اگر یہ اہل کتاب توراۃ اور انجیل کو اور ان ہدایتوں کو جو ان کے رب کی طرف سے ان پر اتاری گئی تھیں قائم کرتے تو اپنے اوپر سے بھی رزق پاتے اور اپنے قدموں کے نیچے سے بھی۔"

سیاسی سربلندی کے بارے میں، جسے غالباً قومی مفادات میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ وہ اللہ رب العزت کی طرف سے یہ قول دیتا ہے کہ:

ان الارض یرثھا عبادی الصالحون(انبیاء:۱۰۵)

"بے شک زمین کی وراثت میرے صالح بندوں کو ملتی ہے۔"

انتم الاعلون ان کنتم مؤمنین(آل عمران:۱۳۹)

"تم ہی غالب رہو گے اگر ایمان والے ہوئے

ان الگ الگ یقین دہانیوں کے علاوہ اس کی ایک جامع یقین دہانی بھی سنیے۔

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما سنخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم اللذین ارتضیٰ لھم و لیبدلنھم من بعد خوفھم امناً (نور:۵۵)

"اللہ تعالیٰ کا تم میں سے ان لوگوں سے، جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے عمل کیے یہ وعدہ ہے کہ وہ انہیں زمین میں اقتدار عطا فرمائے گا۔ اور ان کے لیے ان کے اس دین کی جڑیں گہری جمادے گا جسے ان کے لیے اس نے پسند فرمایا ہے اور ان کے خوف کو امن و سلامتی سے بدل دے گا۔

پھر اسی طات کو منفی شکل میں بھی دیکھیے۔

لایضرکم من ضل اذا اھتدیتم(مائدہ:۱۰۵)

"بھٹکے ہوئے لوگ تمہارا کچھ بگاڑ نہ سکیں گے جب تم سیدھی راہ پر ہو گے۔"

قرآن مجید کے یہ سارے وعدے اور اس کی یہ یقین دہانیاں آپ کے سامنے ہیں ان کی روشنی میں اس خوفِ بربادی کی حقیقت پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے جو اقامت دین کا نام سنتے ہی قومی مفاد کے نام نہاد پاسبانوں پر طاری ہو جایا کرتا ہے۔ کیا اب بھی ایمان کش خام خیالی کو کوئی وزن دیا جا سکتا ہے کہ یہ جدوجہد مسلم مفادات کو نگل جائے گی؟ یا اس کے برعکس یہ باور کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ اگر ایمان و عمل صالح کی جرأت مندانہ زندگی اختیار کر کے صحیح معنوں میں یہ فریضہ انجام دیا گیا تو اس کے نتیجے میں ہمیں ہر وہ چیز مل جائے گی اور قطعاً مل جائے گی جسے قوم و ملت کا وقعی مفاد کہا جا سکتا ہے۔

لیکن اگر کسی بدنصیب کو خود ایمان کی قوت تسخیری ہی سے بدگمانی ہو اور اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر اعتماد نہ ہو تو بڑی زبردستی کرتا ہے اگر اس کے باوجود بھی وہ امت مسلمہ کے معاملے میں کچھ بولنے کا اپنے کو حق دار سمجھتا ہے۔ بلاشبہ ایسے لوگوں کو کوئی بڑی سے بڑی دلیل بھی خوف اور مایوسی کی دلدل سے نہیں نکال سکتی۔ ان کے نزدیک تو اقامت دین کی جدوجہد کیا، نفس اسلام ہی خوف اور تباہی کا سامان ہے۔

ہاں اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس جدوجہد کے نتیجے میں عزت و اقبال اور امن و خوشحالی کا حصول بڑی دشواریوں اور قربانیوں کے بعد ہی ہو گا اور ابتداء میں ملت کو کچھ نہ کچھ کھونا ضرور پڑے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ دشواری کچھ اسی مقصد کی راہ میں نہیں آتی بلکہ یہاں ہر بڑے مقصد کی خاطر اسی طرح کی قربانیاں دینی پڑتی ہیں اور جسے کچھ پانا ہوتا ہے وہ پہلے کچھ نہ کچھ کھو ضرور لیتا ہے۔ ایک کسان فصل اٹھانے کے زمانے میں اپنے کھتے اسی وقت بھر سکتا ہے جب کہ تخم ریزی کے زمانے میں اس نے اسے بقدر ضرورت خالی بھی کیا ہو۔ اس لیے قومی مفادات کی اگر فصل کاٹنی ہو تو اس کے لیے پہلے تخم ریزی کا صرافہ اور دیگر ضروری مشقتیں برداشت کرنی ہی پڑیں گی اور اس حد تک مفادات سے دستبرداری کا اندیشہ ہی نہیں بلکہ یقین بالکل بجا ہے لیکن کیا چند پیسے دے کر اشرفیوں کا توڑا حاصل کر لینا کوئی گھاٹے کا سودا ہے اور کیا اسے مفادات کی تباہی کہا جائے، یا ان کے بہتر سے بہتر حصول اور تحفظ کی بہتر سے بہتر ضمانت؟

پھیر کا راستہ

اب رہا یہ سوال کہ آیا ناساز گار حالات کے پیش نظر ہم نصب العین کے لیے براہ راست جدوجہد کرنے کے بجائے پھیر کا راستہ اختیار کر سکتے ہیں؟ تو اس سوال کا جواب کسی طرح بھی اثبات میں نہیں دیا جا سکتا۔ نہ تو عقل اس کی حمایت کرتی ہے نہ حق کی فطرت اسے گوارہ کرنے کو تیار ہے اور نہ اب تک کی تاریخ سے اس بات کا کوئی ثبوت ملتا ہے، کہ اس مقصد کو صحیح معنوں میں اپنا مقصد زندگی قرار دینے والے کو کسی شخص یا گروہ نے یہ پالیسی اختیار کی تھی۔ یہ جدوجہد متمدن اور غیر متمدن، آزاد اور غلام، دولت مند اور غریب غرض ہر طرح کی قوموں کے اندر چلتی رہی ہے اور ہر طرح کے حالات میں انبیاء آتے رہے ہیں۔ مگر ہر ایک نے آتے ہی س ب سے پہلی آواز جو منہ سے نکالی وہ یہی اور صرف یہی تھی کہ :۔

ان اعبدوا اللہ و اجتنبوا الطاغوت (نحل:۳۶)

"(اے بندگان خدا) خدا کی بندگی کرو اور اطاعت سے دور رہو۔"

کاوش کے باوجود بھی کسی نبی ﷺ کو اس راست پالیسی سے ہٹ کر کوئی پھیر والی پالیسی اختیار کرتے ہوئے نہیں پایا جا سکتا۔ ابھی اس سوال کو چھوڑ دیجیے کہ ان حضرات نے ایسا کیوں کیا؟ پہلے اس حقیقت کو اچھی طرح پرکھ کر دیکھ لیجیے کہ ایسا ہی ہوا یا نہیں؟ اگر ایسا ہی ہوا جیسا کہ واقعہ ہے تو پھر ان لوگوں کے لیے جو اسوۂ انبیاء ہی کو اپنا مرجع کامل مانتے ہوں، اس طریق کار کو چھوڑ بیٹھنا جائز کس حجت شرعی کی بنا ہو سکتا ہے؟ اگر حالات زمانہ کے اختلافات کوئی چیز ہیں تو کیا اس بات کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ تمام انبیاء کے زمانے تو بالکل یکساں نوعیت کے تھے جس کی وجہ سے ان سب کے طرز عمل میں ایسی مکمل یکسانی اور ہم رنگی پائی جاتی ہے اور یہی بیسویں صدی کا زمانہ ایک ایسا انوکھا اور غیر معمولی زمانہ ہے جس کے حالات یکا یک اب تک کی پوری انسانی تاریخ کے حالات سے یکسر مختلف ہو گئے ہیں؟ یقیناً کوئی بھی سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان اس طرح کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ سب جانتے ہیں کہ کچھ بنیادی حقائق تو ایسے ہیں کہ جو کبھی بدلتے نہیں اور جو تمام انسانوں میں یکساں طور سے کار فرما رہے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے۔ یہ صرف ظاہری حالات اور عارضی کیفیات ہوتی ہیں جو ہر دور کی الگ الگ ہوتی ہیں اور آئندہ بھی ہوتی رہیں گی۔ اس لیے اگر ظاہر باتوں کا لحاظ کیا جائے تو جس طرح آج کا زمانہ پہلی صدی ہجری سے مختلف ہے اسی طرح پہلی صدی ہجری کا زمانہ دور عیسوی سے اور دور عیسوی دور موسوی سے بھی لازماً مختلف تھا۔ اب اگر اس اختلاف احوال کے باوجود تمام انبیاء نے یکساں طور پر ہمیشہ براہ راست جدوجہد کی پالیسی اختیار کی، تو اس ظاہری اختلاف کے باوجود بھی، جو ہمارے زمانے اور پچھلے زمانوں میں نظر آتا ہے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم بھی یہی پالیسی اختیار کریں۔ کیونکہ اس کام کے لیے کوئی دوسرا طریقہ اپنایا ہی نہیں گیا اور تمام انبیاء کا اسی طریق کار کو اختیار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس جدوجہد کا مزاج ہی براہ رات اقدام کا طالب ہے یہ دلیل یقین سے بڑھ کر ہم کو حق الیقین کی حد تک پہنچا دے سکتی ہے اگر اس میں تاریخ انبیاء کی یہ گواہی بھی شامل کر دی جائے کہ بعض انبیاء کو پھیر کی پالیسی اختیار کرنے کے بہتر سے بہتر مواقع ہاتھ آئے۔ مگر انہوں نے پوری صفائی اور طمانت کے ساتھ ان کو ٹھکرا دیا۔ خود سید الانبیاء ﷺ کے سامنے قریش کی جس پیش کش کا تذکرہ پچھلے صفحوں میں آچکا ہے غور فرمایئے، اس نے اس پالیسی کا کیسا سنہری موقع فراہم کر دیا تھا؟ جب انہوں نے کہ آپ کو ہم اپنا بادشاہ بنائے لیتے ہیں اور اس کے لیے ہم آپ سے یہ مطالبہ بھی نہیں کرتے کہ آپ اپنی "دعوت توحید" سے دست کش ہو جائیں۔ آپ سے ہماری صرف اتنی گزارش ہے کہ آپ ہمارے بتوں کی تردید اور تحقیر کرنے اور ہمارے دین کی عیب چینیا فرمانے سے باز رہیں..................... تو آج کے اہل سیاست وتدبر کے نقطہ نظر سے یہ پیش کش یقیناً ایک نعمت غیر مترقبہ ہی تھی اور اس کو ٹھکرا دینے کی بابت کچھ سوچنا بھی حرام مطلق سے کم نہ تھا۔ انہیں اگر مشورہ دینے کا موقع ملتا تو ان کا مشورہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہوتا کہ آپ اس پیش کش کو فوراً قبول فرما

لیں، تاکہ اس سے ایک طرف تو ان مصیبتوں اور فتنوں کا بھی خاتمہ ہو جائے جو آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے پیروؤں کی زندگی اجیر ان کیے ہوئے ہیں دوسری طرف تخت حجاز پر قابض ہو چکنے کے بعد آپ اپنے حاکمانہ اثر و اقتدار سے کام لیتے ہوئے "حکمت" کے ساتھ اپنے دین کی جڑیں مضبوط کرتے جائیں، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ پورے عرب پر قائم ہو جائے۔ مگر آپ کو معلوم ہے کہ پیغمبر عالم ﷺ نے اس "سنہرے" موقع پر کیا طرز عمل اختیار کیا؟ اور اس پیش کش کا کیا جواب دیا؟ یہ کہ:

ما جئت بما جئتكم به اطلب اموالكم و لا الشرف و لا الملك عليكم فبلغتكم رسالات ربى و نصحت لكم فان تقبلوا منى ما جئتكم به فهو حظلكم فى الدنيا و الاخرة و ان تردوه على اصبر لامر الله حتى يحكم بينى و بينكم (ابن ہشام: جلد ۱)

"میں تمہارے پاس جو پیغام لے کر آیا ہوں اس سے میری غرض یہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ تمہاری دولت حاصل کر لوں یا جاہ و عظمت کا مالک بن جاؤں یا تمہارا بادشاہ بن جاؤں، سو میں نے تمہیں اپنے رب کے پیغام پہنچا دیئے اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ اب اگر تم میری دعوت کو مان لیتے ہو تو وہ تمہارے لیے دنیا و آخرت میں باعث خیر ثابت ہو گی اور اگر اسے رد کر دیتے ہو تو میں پوری مضبوطی سے اپنے کام میں لگا رہوں گا یہاں تک کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کر دے۔"

یہ کسی جوشیلے اور جذبات کی رو میں بہنے والے انقلابی نوجوان کے الفاظ نہ تھے بلکہ اس معلم حکمت و دانش کے الفاظ تھے، جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ اس کے دل اور زبان پر خدا کی نگرانی قائم تھی اور جس نے کبھی کوئی بات جذبات سے بے قابو ہو کر نہیں کہی۔ اس لیے ایک مومن تو اس وہم کو قریب بھی نہ پھٹکنے دے گا کہ آنحضرت ﷺ نے اس پیش کش کا حق نہیں پہچانا اور ایک ایسے طریق کار کے ہاتھ آتے ہوئے بھی اسے عمداً ترک کر دیا، جو حصول مقصد کے لیے راست جدوجہد سے زیادہ موزوں اور کارگر تھا۔ یا یہ کہ آپ میں نعوذ باللہ آج کے نام نہاد مدبروں جیسی بھی انجام بینی نہ تھی کہ ماحول اور زمانے کے تقاضوں کا اندازہ کر سکتے اور اس کے نتیجے میں اس پالیسی کو اختیار کر لیتے، ایسا کوئی گمان بھی مسلمان کے لیے ممکن نہیں اب اگر آپ نے موقع ملنے کے باوجود دعوت حق اور اقامت دین کا براہ راست طریقہ ترک نہیں کیا تو یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ پھیر کا راستہ اختیار کرنا کسی اور "حکمت و دانش" کے مطابق ہو تو ہو مگر نبوی حکمت و دانش کے مطابق ہر گز نہیں ہے۔

خالص عقلی حیثیت سے بھی دیکھیے تو اس طرز فکر اور اس نظریئے میں حیلہ جوئیوں، خوش گمانیوں اور خود فریبیوں کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔ پھیر کے راستے اختیار کرنے کے معنی یہی ہیں کہ ایک زمانے تک حق کو باطل نما بنا کر پیش کیا جائے، اور جس باطل میں مسلمان گھرا ہوا ہے اس سے نکل کر حق کی طرف بھاگنے کے بجائے ایک دوسرے باطل کے سائے میں جا کھڑا ہو۔ کیونکہ اگر وہ موجودہ باطل کو درہم برہم کر کے ایک ایسا ماحول قائم کرنے کی کوشش کرے گا جو حق نہ ہو تو وہ لازماً باطل ہی ہو گا۔ جس کا رنگ و روغن تو نیا ضرور ہو گا مگر اصل فطرت اس کی بھی بہر حال وہی ہو گی جو موجودہ باطل کی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم اس پر اثر ڈال کر اپنے نصب العین کے لیے نسبتاً زیادہ سازگار بنا لیں گے مگر افسوس ہے کہ دنیائے عمل میں اس خام خیالی کی کوئی قیمت نہیں۔ کیونکہ باطل خواہ کوئی قالب اختیار کرے وہ حق کے لیے بھی سازگار نہیں ہو سکتا اور اگر اس میں حق کے کچھ پیوند آپ بہ ہزار وقت لگا بھی لیں گے تو بھی وہ آپ کے اصل مقصد کے لیے خالص باطل سے کم مضر ثابت نہ ہو گا۔ دور نہ جائیے۔ اسی ہندوستان میں بہت سی اسلامی ریاستیں قائم ہیں جن میں کم و بیش وہ تمام باتیں موجود ہیں جن کا آپ آئندہ نظام ملکی میں جوڑ لگانا چاہتے ہیں مگر وہاں اقامت دین کا نام ہی لے کر دیکھیے زندگی عذاب بنے بغیر نہ رہ سکے گی، آپ اپنی اس جدوجہد میں غیر ملکی حکومت ہی کو سد راہ سمجھتے ہیں اور اسی لیے اس کے ہٹ جانے کا انتظار کر رہے ہیں۔ مگر آپ شاید بھولتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کے مشن کے متعلق رومی اقتدار بھی خاموش ہی تھا کہ ان کی اپنی قوم، یا یوں کہیے کہ اس وقت کے "مسلمانوں" ہی نے بڑھ کر اس کی مشکیں کس دیں۔ پھر اپنی حال کی تاریخ پر نظر ڈالیے شیخ جمال الدین افغانی نے ایک ایسی

تحریک اٹھائی جو صرف فی الجملہ دینی تحریک تھی، مگر آپ کی انہی موجودہ "اسلامی" حکومتوں نے ان کو رہنے کے لیے جگہ دینے تک سے انکار کر دیا اور اگر آج بھی کسی کو ہمت ہو تو ان ممالک میں یہ آواز اٹھا کر قدر عافیت معلوم کر سکتا[ا] ہے۔

ا۔ یہ الفاظ اس وقت لکھے گئے تھے جب لا الہ الا اللہ کی بنیاد پر قائم کی جانے والی "مملکت خداداد پاکستان" ابھی وجود میں نہیں آئی تھی۔ وجود میں آچکنے کے بعد اس کے ناخداؤں نے وہاں کی اسلامی تحریک کے ساتھ جو کچھ کیا اور پھر چاہنے کے باوجود جو کچھ وہ کر نہ سکے وہ سب کے سامنے ہے۔ اسی طرح مصر کی فوجی حکومت نے وہاں کے اسلام پسندوں کے ساتھ جس بربریت کا سلوک کیا وہ اس تلخ حقیقت کی سب سے زیادہ نمایاں اور عبرتناک مثال ہے۔

درحقیقت یہ دفع الوقتی کی باتیں ہیں اور یہ نظریہ اسی ذہنیت کی پیداوار ہے جس نے دعوت قرآنی کے جواب میں حالات کی "ناسازگاریوں" سے گھبرا کر نبی ﷺ سے مطالبہ کیا تھا۔ ائت بقرآن غیر ھذا او بدلہ یعنی اس کے بجائے کوئی اور قرآن لائیے یا پھر اس میں کچھ ایسی ترمیمیں کر دیجیے۔ جن کے بعد وہ ہماری خواہشوں کے ساتھ اور زمانہ وماحول سے ہم آہنگ ہو جائے۔ اس طرز پر سوچنے والوں کی نگاہ شاید اس طرف نہیں جاتی کہ دنیا کے ہنگامے جیسے آج ہیں کل بھی ویسے ہی رہیں گے، اور جو مصالح اور مشکلات آج ان کا راستہ روک رہی ہیں آئندہ بھی ان میں کوئی کمی رونما نہ ہو گی۔ اس لیے اس پالیسی کا حاصل صرف یہ ہو گا کہ نہ کبھی پھیر کے راستے اختیار کرنے کے اسباب، محرکات ختم ہوں گے نہ اقامت دین کے لیے براہ راست جدوجہد کی کبھی نوبت آسکے گی[ا]۔

ا۔ جس وقت الفاظ لکھے گئے تھے اس وقت تک یہ بات بھی محض ایک قیاس کی حیثیت رکھتی تھی لیکن تقسیم ہند کے بعد سے لے کر اب تک کی تاریخ اسے بھی ایک حقیقت واقعی ثابت کر چکی ہے آزادی سے پہلے ہمارے جہاندیدہ ارباب دین و سیاست بڑی بزرگانہ شان سے فرمایا کرتے تھے کہ اس وقت یہاں انگریز اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہے۔ پہلے اسے اکھاڑ دو، پھر آزادی کی فضا میں اس کام کو یکسو ہو کر کیا جائے گا۔ مگر آج آزادی کی کھلی فضا میں بھی یہ مبارک زبانیں اس طرح بند ہیں کہ حال تو حال، مستقبل بعید کے بارے میں بھی کوئی کلمہ تشفی سنانے کی جرأت نہیں ہو رہی ہے۔

۳۔ کلی اور ابدی مایوسی

حیرت انگیز حیاکشی:

تیسرا گروہ جو کچھ کہتا ہے، اس کے سوچنے کا جو انداز ہے اور اس کے جو دلائل ہیں، وہ سب قریب قریب وہی ہیں جو دوسرے گروہ کی زبانی گزشتہ بحث میں آپ سن چکے ہیں۔ اس لیے انہیں دوبارہ نقل کرنے اور ان کی غلطی واضح کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ ایک حیثیت سے یہ لوگ ان سے مختلف ضرور ہیں اور وہ یہ کہ فرض ناشناسی اور مقصد فراموشی کی جو بیماری وہاں سیاسی دور اندیشی اور زمانے کی مصلحتوں کے پردے میں چھپا دی گئی تھی۔ یہاں وہ صاف گوئی اور جرأت کے ساتھ ظاہر کر دی گئی ہے اس لیے ان لوگوں کے ظاہر و باطن کی ہم رنگی کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس ایمانی بے غیرتی کا تصور، جو اس صاف گوئی اور جرأت اظہار کے پیچھے کام کر رہی ہے دل پر بڑی سخت چوٹ لگاتا ہے۔ اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ان لوگوں نے اپنے جسم سے کپڑے اتار کر پھینک دیئے ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان میں کتنوں نے یہ حیاکشی ہوش اور بیداری کے عالم میں کی ہے اور کتنوں نے غفلت اور بے ہوشی کی حالت میں؟ ایک طرف تو اقامت دین کی اس اہمیت کو دیکھیے کہ اس کے بغیر مسلمان کا کوئی مؤقف ہی باقی نہیں رہ جاتا؟ دوسری طرف ان حضرات کا یہ ارشاد سنیے کہ یہ نصب العین ہے تو بالکل برحق، مگر ہم جیسے کمزور لوگوں کے بس کا یہ کام نہیں ہے۔ جس مشن کو پیغمبر ﷺ کی تربیت یافتہ جماعت بھی تیس برس سے زیادہ نہ چلا سکی۔ اس کے لیے ہم جیسے ضعیف

الایمان لوگوں کا دم خم دکھانا تقدیر سے لڑنا ہے۔اب وہ زمانہ واپس نہیں آسکتا جو تیرہ سو برس پہلے گزر چکا ہے اس ارشاد کا ظاہر یقیناً بڑا عاجزانہ ہے مگر تہہ میں اتر کر دیکھیے تو یہ عاجزانہ نہیں بلکہ باغیانہ نظر آئے گا۔جب اقامت دین کی جدوجہد سے از خود کنارہ کش ہو کر اور باطل و منکر کے ساتھ عدم تعرض کی پالیسی اختیار کر کے انسان پیروان اسلام کی صف پائیں میں بھی جگہ نہیں پا سکتا اور اللہ کے رسول ﷺ نے ایسے شخص کو ایمان کے آخری ذرے سے بھی محروم قرار دیا ہے تو سوچنے کی بات ہے کہ بڑی سے بڑی کمزوری اور مایوسی بھی اس فرض کی انجام دہی سے بے تعلق ہو جانے کا کوئی حق کیسے دلا سکتی ہے؟ اگر کہیں فی الواقع یہ بے تعلقی ہے تو ماننا پڑے گا کہ کسی کمزور سے کمزور ایمان کی تلاش بھی وہاں بے سود ہے۔اسلام نے اپنا کوئی "سستا ایڈیشن" شائع نہیں کیا ہے جس کے تحت اس "دم خم دکھانے" سے نجات ممکن ہو۔وہ شخص دھوکے میں ہے جو یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ اس قطعی لازمہ ایمانی سے بے بہرہ رہ کر بھی ایمان اور رضائے الٰہی کی کوئی مقدار حاصل کی جا سکتی ہے۔

تاریخ خلافت کا "استدلال"

اس طرز فکر کی بنیادوں میں سب سے زیادہ اہمیت اور مرکزیت جس چیز کو حاصل ہے اور جو ایک نئی "دلیل" کی حیثیت بھی رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ جو چیز صحابہؓ کے ہاتھوں میں تیس برس سے زیادہ پوری طرح قائم نہ رہ سکی۔اس کے لیے اب کوئی سعی بالکل لا حاصل ہے۔یہ "دلیل ان معنوں میں یقیناً ایک زبردست دلیل ہے کہ اس کا عام لوگوں کے حوصلوں پر بڑا مرعوب کن اثر پڑتا ہے۔چنانچہ واقعات شہادت دیتے ہیں کہ مسلمانوں کے اندر مایوسی اور دل شکستگی کا زہر پیدا کرنے میں اس خیال نے جتنا مؤثر پارٹ ادا کیا ہے اس کا اندازہ بھی مشکل ہے لیکن یہ بات کہ یہ "دلیل" واقعتاً بھی دلیل ہے اور وہ عام جذبات ہی کو متاثر نہیں کرتی بلکہ عقل سے بھی اپنا وزن تسلیم کرا سکتی ہے۔حقیقت سے بالکل دور ہے کیونکہ اس استدلال میں جس چیز کو بنیاد قرار دے کر اقامت دین کے فریضے کو اپنے حق میں ساقط سمجھ لیا گیا ہے اس کا اس فریضے کی ادائیگی سے فی الواقع کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔کسی اصول اور نصب العین پر جب آپ ایمان لا چکے تو اس کے مطالبات آپ کو بہر حال پورے کرنے پڑیں گے۔اور اس بات کو آپ کی ذمہ داری پر ہر گز اثر نہیں پڑ سکتا کہ اسے کبھی ایک لمبے عرصے تک نافذ العمل نہیں رکھا جا سکا ہے۔اور اگر اس بنیاد پر کسی نے اپنی ذمہ داری کو ادا کرنا چھوڑ دیا تو یہ اس کے قول و عمل کے تضاد کی ایک بدترین مثال ہو گی۔سوچنا چاہیے کہ ہم نے اسلام کی علم برداری آیا اس لیے قبول کر رکھی ہے کہ وہ فی نفسہ حق ہے، یا اس کا کوئی اور سبب ہے؟ اگر کوئی اور سبب ہے تو پھر ہم پر دینی اور اخروی جہت سے اس کا کوئی مطالبہ واجب ہو ہی نہیں سکتا۔نہ ہم پر اس کے لیے کسی جدوجہد کے ترک کر بیٹھنے کا الزام لگ سکتا ہے لیکن اگر پہلی بات ہے، جیسا کہ ایک ایک مسلمان کے بارے میں توقع کی جانی چاہیے تو ایک غیر مسلم بھی تاریخ خلافت کی آڑ لینے میں ہمیں حق بجانب نہیں قرار دے سکتا۔تیس اور چالیس برس تو درکنار، اگر یہ نظام اپنی اصل اور معیاری شکل میں کامیابی کے ساتھ کبھی ایک ن بھی قائم نہ رہ سکا ہوتا تو بھی اس کے قائم کرنے کی ہماری ذمہ داری اپنی جگہ جوں کی توں باقی ہی رہتی اور اس کے لیے سر دھڑ کی بازی بہر حال لگانی ہی پڑتی۔جب ہم نے اس کو حق مانا اور اس کی علمبرداری کا دعویٰ کیا ہے تو ہمارے لیے یہ دیکھنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی کہ اس راہ میں کس نے کیا کیا اور کب کیا؟ اب ہمارے فرائض کی تعیین وہ نصب العین کرے گا جس کو حق سمجھ کر ہم نے قبول کر رکھا ہے، تاریخ نہیں کرے گی۔

غالباً اس نام نہاد دلیل کے قریب ترین منطقی نتائج پر بھی غور نہیں کیا گیا۔ورنہ اتنی غلط بات منہ سے نہ نکالی جاتی۔اگر اقامت دین کی جدوجہد کے بارے میں اس طرح کے صغریٰ کبریٰ سے کام لینا صحیح ہے تو آیئے یہ بھی دیکھ لیجیے کہ یہ منطق ہمیں کہاں پہنچا دیتی ہے؟ آپ نے پڑھا ہو گا کہ کتاب و سنت میں ایک مثالی مومن کی فلاں فلاں صفات بیان ہوئی ہیں اور یہ کہ اللہ و رسول ﷺ نے معیاری ایمان و اسلام کا بڑا اونچا تصور پیش کیا ہے اتنا تصور کہ اس پر پورے اترنے والے انسان ابو بکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ، ابو ذر غفاریؓ، سلمان فارسیؓ، بلال حبشیؓ اور انہی کی طرح

کے چند سو یا چند ہزار نفوس سے زیادہ نہیں پیدا ہو سکے اور اس وقت تو اس معیار کا مسلمان شاید ڈھونڈھنے سے بھی نہ ملے۔ تو اب ذرا اسی منطق سے، جس نے خلافت راشدہ کے مثالی اور معیاری دور کا حوالہ دے کر ہم کو اقامت دین کی جدوجہد سے دور ہی رہنے کی ہدایت کی ہے۔ معیاری مسلمان بننے کی خواہش اور کوشش بلکہ مطلقاً مسلمان ہی باقی رہنے کی بابت بھی فتویٰ پوچھیے۔ اسے یقیناً فتویٰ یہی دینا پڑے گا کہ اب ایسے معیاری ایمان کا ذکر اور خیال چھوڑ دینا چاہیے اور ان مطلوبہ مثالی صفات کے لیے کوشش بند کر دینا چاہیے۔ حتیٰ کہ مسلمان باقی رہنے کی خواہش بھی غلط ہو گی کیونکہ استدلال کو غلط نہیں سمجھتے تو اس دوسرے استدلال کو بھی رد نہیں کر سکتے۔ اگر خلافت راشدہ کی قلیل العمری اجتماعی اور سیاسی پہلو سے ہمیں اس امر کا حق دلا سکتی ہے کہ اب قیامت تک کے لیے قیام دین کے تصور سے ذہنوں کو خالی کر لیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ تدوین و تقویٰ کے سلسلے میں اس "استحقاق معذرت" کو قبول نہ کیا جائے۔ لیکن عجیب ماجرا ہے کہ اگرچہ اب ایک "ابوبکر" بھی پیدا نہیں ہو رہا ہے مگر ایک شخص بھی صدیقی اور فاروقی ایمان کے حصول سے مایوس ہو کر اسلام سے علیحدگی پر، یا معیاری ایمان کی خواہش و کوشش سے دست برداری پر تیار نہیں۔ اس کے بخلاف ہو یہ رہا ہے کہ خود بھی اوپر اٹھانے کی کوششیں معیاری ہیں اور دوسروں کو اچھا مسلمان بنانے کے لیے تبلیغی انجمنیں قائم کی جاتی ہیں۔ اشاعت دین کے ادارے کھولے جاتے ہیں تعلیم کتاب و سنت کے لیے درسگاہیں جاری کی جاتی ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ صدیقؓ و فاروقؓ کی سی اسلامیت کے حصول سے مایوس ہونے کے باعث اسلام کا نام لینا چھوٹ دیا جاتا؟ اس کے جواب میں آخر یہی تو کہا جائے گا نا کہ ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ اسلام کی اعلیٰ اور مثالی نمونے تھے۔ ان کے جیسا ایمان و تقویٰ اگر ہم اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سرے سے اسلام ہی چھوڑ دیں بلکہ ہمارے کرنے کا کام یہ ہے کہ ان نمونوں کو سامنے رکھ کر اپنی استطاعت کے مطابق پوری کوشش کریں اور جہاں تک ہو سکے۔ اسی طرح کا تدین پیدا کرنے کی فکر میں برابر لگے رہیں۔ تاریخ نے ہمارے سامنے اسلام کے یہ اعلیٰ ترین نمونے رکھ دیئے ہیں تاکہ وہ ہمارے لیے معیار اور مثال کا کام دیں اور ہم میں سے جسے جتنی توفیق ملے اپنے آپ کو ان کا ہم رنگ بنانے کی کوشش کرتا رہے اور جس مقام پر وہ تھے اس کی طرف جتنے قدم بڑھا سکتا ہے، بڑھاتا رہے۔ سوال یہ ہے کہ یہی بات اقامت دین کے سلسلے میں بھی کیوں نہیں سوچی اور کہی جاتی! اس اصولی بات کو ایمان و عمل کے ایک دائرے ہی تک کیوں محدود کر لیا جاتا ہے۔ اس کے اطلاق کو کیوں نہیں وسیع تر مسائل تک پھیلنے دیا جاتا؟ اس تحدید کی کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی، اس لیے ضروری ہے کہ اس اصولی نقطہ نگاہ سے آپ خلافت راشدہ سے تعلق رکھنے والی اس بحث کو بھی دیکھیں۔ حضرات ابوبکر و عمر اور عثمان و علی رضوان اللہ علیہم کی انفرادی زندگیوں کی طرح ان کا طرز خلافت بھی ایک معیاری اور مثالی نمونے کے کام دیتا رہے اور جس حد تک ان کے دست و بازو میں خدا نے توانائی بخشی ہو اس نمونے کے اتباع میں برابر کوشاں رہیں اور اس وقت تک اطمینان کا سانس نہ لیں جب تک کہ ان کا قائم کیا ہوا نظام اس نمونے کا عکس نہ بن جائے، ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ ان پاکان خاص کا ایمان و تقویٰ انفرادی زندگیوں میں ہمارے لیے ایک ایسا معیاری نمونہ ہے جسے سامنے رکھ کر ہمیں اپنے ایمان و تقویٰ کو مسلسل فروغ دینے کی پوری پوری کوشش کرنا ضروری ہے۔ اس سعی و کوشش میں جس حد تک کامیابی ہو جاتی ہے اسی حد تک ہم مکلف اور مسؤل بھی ہیں اور اسلام کو اس کے صحیح رنگ میں جس حد تک قائم کر سکتے ہیں اسے دین اللہ کا قیام ہی کہا جائے گا۔ جس طرح ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ بن جانا ہم پر فرض نہیں، بلکہ ان کے کامل نمونوں کو سامنے رکھ کر حتی الامکان ان سے بیش از بیش مماثلت پیدا کرنا ہی ہمارا فریضہ ہے اسی طرح ہم ہر حال میں انہی جیسی معیاری خلافت کا قائم کر دینا ہماری ذمے داری نہیں ہے۔ ہماری اصل ذمے داری صرف یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے ان کی قائم کی ہوئی خلافتوں سے زیادہ سے زیادہ مشابہت رکھنے والا اجتماعی نظام قائم کرنے کی پوری سعی کریں، اور آگے آنے والی نسلیں یکے بعد دیگرے اس مشابہت کے رنگ کو اور زیادہ نکھارتے رہنے کی کوشش کرتی رہیں۔

اس لیے اس تیس سالہ دور خلافت کو اپنے لیے مثال اور اسوہ بنایئے اور س کی بلندیوں سے دہشت کھا کر بھاگ کھڑے ہونے کے بجائے اس سے درس عمل لیجیے۔ انسانیت کا یہ دور سعادت اقامت دین کی جدوجہد پر ابھارنے والی چیز ہے نہ کہ اس سے بددل کرنے والی۔ اگر اس کے نام سے دلوں میں مایوسی اور افسردگی کی لہریں اٹھیں۔ اس نام میں تو بلا کی کشش، اور اس کشش میں طوفان کا سا جوش بھرا ہوا ہے۔ اگر مسلمان کو یقین ہے کہ انسانیت کی فلاح صرف دین حق کے قیام ہی سے وابستہ ہے اور اگر اس کا سینہ اس مبارک زمانے کی سچی قدر و محبت سے خالی نہیں ہو گیا ہے جس میں خدا کی مرضی زمین پر بھی اسی طرح پوری ہو رہی تھی جس طرح کی آسمان پر پوری ہوتی رہتی ہے تو اس یقین اور سا قدر و محبت کا فطری تقاضا ہے کہ دل اس گزری ہوئی خوشگوار حقیقت کو واقعات کی دنیا میں پھر سے کار فرما دیکھنے کے لیے مسلسل بے قرار رہے جس شخص کے ایمان میں یہ بے قرار روح نہ ہو وہ در اصل ایمان ہی نہیں بلکہ ٹھنڈے تصورات کا ایک بت کدہ ہے۔

اسلامی نظام کے متعلق ایک شدید غلط فہمی

اوپر کی سطروں میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے فی نفسہ یہ خیال ہی غلط ثابت ہے کہ اسلامی نظام تیس سال قائم رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ عجیب و غریب خیال کچھ ٹھوس علمی اور تاریخی حقائق سے پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ اسے بالقصد پیدا کیا گیا ہے اس خیال کے پیدا کرنے میں چالاک دشمنوں کی عیاری اور نادان دوستوں کی سادہ لوحی دونوں ہی شامل ہیں۔ امر واقعہ صرف یہ ہے کہ جس طرح حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بعد بھی مسلمان پیدا ہوئے اور برابر ہوتے رہے اس طرح ان کی خلافتوں کے بعد بھی مدتوں اسلامی نظام قائم رہا فرق صرف یہ تھا کہ جس طرح ان حضرات کی شخصیتیں بے داغ تھیں۔ اسی طرح ان کی خلافتیں بھی خیر کامل کا نمونہ تھیں اور جس طرح بعد میں آنے والی شخصیتیں ناقص تھیں اسی طرح ان کے وقت کا طرز خلافت بھی ناقص تھا۔ شخصیتوں کا ناقص ہونا اگر کسی حال میں بھی ان کے غیر مسلم ہونے کے ہم معنی نہیں تو اس طرز خلافت کے ناقص ہونے کے معنی بھی یہ نہیں ہو سکتے کہ یہ خلافتیں غیر دینی اور ان کا زیر عمل نظام غیر اسلامی تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ جس طرح مسلم افراد میں اسلامیت کے مدارج مختلف ہوتے ہیں اس طرح کتاب و سنت کو اصل ماخذ قانون تسلیم کر کے چلائے جانے والے سیاسی نظاموں کے بھی مدارج مختلف ہوتے ہیں۔ جس طرح اشخاص میں کمزوریاں ہوتی ہیں اسی طرح اسٹیٹ میں بھی ہوتی ہیں۔ چنانچہ خود اس تیس سالہ خلافت راشدہ کے سب دور میں اپنی روح میں یکساں نہ تھے۔ بلکہ عثمانی اور علوی خلافتیں صدیقی اور فاروقی خلافتوں سے کم معیاری تھیں جس پر احادیث اور تاریخ دونوں شاہد ہیں اس لیے جب ہم افراد کی کمزوریوں پر تنقید تو کرتے ہیں مگر ان کو دائرہ اسلام سے خارج نہیں سمجھتے تو اس تیس سالہ دور خلافت کے بعد قائم رہنے والے سیاسی ڈھانچوں پر بھی سخت سے سخت تنقید تو کی جا سکتی ہے اور ان کو جاہلیت کے عناصر سے مخلوط بھی کہا جا سکتا ہے۔ مگر انتہائی زیادتی ہو گی اگر انہی بالکلیہ غیر اسلامی اور جاہلی قرار دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح علمائے حق بد عمل مسلمانوں کی ہدایت و تذکیر کا فرض ادا کرتے آئے ہیں۔ اسی طرح وہ ان ناقص حکمرانوں کی غلط کاریوں پر ضرور ٹوکتے رہے اور ان کے طرز حکومت کے نقائص پر اظہار تکیر کرتے ہوئے ان کی اصلاح کی برابر کوششیں کرتے رہے ہیں مگر اس سے آگے بڑھ کر انہوں نے ان کے خلاف یہ فتویٰ کبھی صادر نہیں کیا کہ یہ حکومتیں سراسر غیر اسلامی اور کافرانہ ہے۔ غرض خلافت راشدہ کے بعد بھی مدتوں جو سیاسی نظام اسلامی ممالک میں جاری رہے جو کم و بیش اسلامی ہی تھے۔ عدالتیں اسلامی قانون کے مطابق فیصلے کرتی تھیں سزائیں احکام شریعت کے تحت دی جاتی تھیں۔ جائدادیں دینی ضوابط کی رو سے تقسیم کی جاتی تھیں۔ مختصر یہ کہ جو کچھ خرابی تھی حکمرانوں کے طرز انتخاب میں اور ان کی ذات میں تھی ورنہ جہاں تک زندگی کے عام معاملات کا تعلق ہے اتھارٹی کتاب و سنت ہی کو حاصل تھی اور اس کے گوشے گوشے پر نظام دین کی بالادستی بدستور چھائی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ خراب سے خراب حکمران

بھی اپنی کوئی غیر اسلامی کاروائی انجام دینے کے لیے اس بات پر مجبور تھا کہ چہرے پر تشرع کی نقاب ڈال لے اور اس بات کا وہ تصور تک نہیں کر سکتا تھا کہ خدا کے دین اور قانون کی جگہ اپنا دین اور قانون چلا دے۔

غلط فہمی نہ ہو اس تقریر کا منشایہ نہیں ہے کہ ان تمام حکومتوں کو خالص السلامی حکومت قرار دے دیا جائے، خلافت راشدہ کے بعد قائم ہوتی رہی ہیں اور نہ اقامت دین کا فریضہ یاد دلانے کا یہ مقصد ہے کہ معتصم باللہ یا ہارون رشید کی طرح کوئی نظام حکومت قائم کرنے کی دعوت دی جارہی اور اس پر مطمئن ہو جانے کے بعد بھی اللہ کا دین ایک لمبی مدت تک دنیا میں قائم و نافذ رہا۔ اگرچہ جس انداز میں وہ قائم و نافذ تھا وہ اپنے مظاہر کے اعتبار سے بھی مگر ان تمام نقائص کے باوجود اس کے بحیثیت ایک اسلامی نظام کے قائم و نافذ رہنے کی نفی ہر گز نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے یہ پروپیگنڈہ کرنا کہ یہ نظام صرف چند دنوں قائم رہا۔ ایک علمی بددیانتی اور تاریخ سے بہت بڑی فریب کاری ہے۔ اس کا مقصد یا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اسلام اور اسلامی نظام سے لوگوں میں بدگمانی پیدا کر دی جائے۔

اسلامی نظام سب سے زیادہ عملی نظام

جو لوگ خلافت راشدہ کو دوسرے لفظوں میں اسلامی نظام کے معیاری قیام و نفاذ کی، قلیل العمری کو اس بات کی دلیل بناتے ہیں کہ اپنی داخلی نوعیت ہی کے اعتبار سے اب ایک ناممکن العمل نظام ہے انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ اسلام کے مقابلے میں وہ کون سا نظام ہے جو اپنے نظریاتی معیار کے مطابق اس سے زیادہ مدت تک قائم اور نافذ رہ سکا ہے؟ اگر وہ بتانا بھی چاہیں گے تو شاہی یا آمریت کا نام تو بہر حال نہ لیں گے کیونکہ یہ دراصل نظام ہی نہیں اور اگر وہ نظام ہیں تو بھی ایسے نظام ہیں جن کی بنیاد جنگل کے آئین پر ہوتی ہے اور جس کو پوری انسانیت متفقہ طور سے رد کر چکی ہے۔ اس لیے لے دے کر وہ صرف جمہوری اور اشتراکی نظاموں کا نام لے سکتے ہیں جن کا کہ آج پوری دنیا پر سکہ چل رہا ہے اور جن کی مدح و منقبت میں اپنے اپنے کیمپ سے بہت کچھ کہا جاتا رہا ہے، لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ آج تک ان کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا ہو کہ وہ کبھی، تیس سال نہیں، تیس مہینے ،بلکہ تیس دن بھی اپنے معیاری تنگ میں قائم اور نافذ کیے جاسکے ہیں۔ اس کے بخلاف تاریخ و سیاست کا پورا لٹریچر اس بات کے اعتراف سے بھرا پڑا ہے کہ جمہوریت ہو یا اشتراکیت کوئی بھی عملاً اپنے نظریاتی معیار تک نہیں پہنچ سکی ہے اور کتابوں میں درج نظریات واقعات کی دنیا میں اپنا کوئی وجود نہیں رکھتے۔

جمہوریت کے بارے میں مشہور مفکر برنارڈ شا کہتا ہے کہ

"اس مقصد کے حصول میں ایک ایسی مشکل حائل ہے جو تقریباً قابل حل ہے اور وہ یہ خوش فہمی ہے کہ ہر فرد کو ووٹ دینے کا حق مل جانا جمہوریت کی کامیابی کی ضمانت ہے حالانکہ یہی وہ چیز ہے جس سے جمہوریت کے مقاصد قطعی طور پر فوت ہو جاتے ہیں۔ بالغ رائے دہندگی کا اصول جمہوریت کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ پڑھے لکھے اور اونچی فکر رکھنے والے لوگ جمہوریت چاہتے ہیں لیکن پولنگ اسٹیشنوں پر ان کی حیثیت ایک معمولی اقلیت کی ہوتی ہے۔"

اطالوی ربر میزینی لکھتا ہے کہ

"انسان بادشاہ کی شکل میں ایک ہو یا جمہوریت کی شکل میں زیادہ ہوں بات یکساں ہی رہے گی۔"

ڈین رنج صاف کہتا ہے کہ

"ایک مکمل جمہوریت بھی اس حد تک جمہوری نہیں ہو سکتی جس حد تک نظریہ جمہوریت اسے جمہوری بتاتا ہے۔"

لارڈ برائس اور جمہوریت کے دوسرے بہت سے حامیوں نے اپنے کو اس اعتراف پر مجبور پایا ہے کہ:

"حقیقی جمہوریت کبھی بھی، اور دنیا کے کسی گوشے میں بھی معرض وجود میں نہیں آسکی ہے۔"

رہی اشتراکیت، تو اس کا مقدمہ جمہوریت سے بھی زیادہ کمزور ہے حتی کہ چونکہ اس وقت گفتگو کا موضوع ہے اس کی بحث میں وہ کسی ذکر کے قابل ہی نہیں ہے یہ مخالفانہ پروپیگنڈے کی بات نہیں ہے بلکہ ایک بے تسلیم شدہ اور بدیہی حقیقت کا اظہار ہے۔ چنانچہ اگر وہ غرض وغایت سن لی جائے جو اس اشتراکیت کے پیش نظر ہے تو یہ حقیقت سورج کی طرح خود عیاں ہو جائے گی۔ اشتراکیت کے مشہور و مستند امام فریڈرک اینجلز کے بیان کے مطابق اشتراکی نظام کی غایت مقصود یہ ہے:۔

"ایک ایسے سماج کی تشکیل جس میں نہ مختلف طبقات ہوں گے نہ انفرادی بقاء کے لیے کش مکش ہو گی۔ انسان فطرت کا باشعور آقا ہو گا اپنی تاریخ خود بنائے گا۔ مجلسی اسباب اس کی اپنی مرضی کے مطابق نتائج پیدا کریں گے وہ احتیاج کی دنیا سے نکل کر اختیار کی دنیا میں داخل ہو چکا ہو گا اور ریاست و حکومت ماضی کی یادگاریں بن چکی ہوں گی۔" (سوشلزم)

آج اشتراکیت کو اقتدار حاصل کیے ہوئے تقریباً چالیس سال ہو چکے ہیں اور اس وقت وہ متعدد ملکوں میں داد حکمرانی دے رہی ہے مگر کیا کہیں بھی یہ نظریاتی سماج دکھائی دے رہا ہے؟ روس اس کا سب سے پہلا گہوارہ اور مضبوط قلعہ ہے مگر کیا کبھی کسی کی زبان سے یہ دعویٰ سنا گیا ہے کہ وہاں نہ طبقات ہیں نہ احتیاج ہے، نہ ریاست ہے نہ حکومت ہے۔ اور ہر شخص اپنی تاریخ خود بنا رہا ہے، ظاہر ہے کہ جب وہاں یہ سب چیزیں موجود نہیں ہیں تو ایسا پہاڑ جیسا جھوٹ کون بول سکتا ہے۔ چنانچہ اشتراکیت کے سارے حامیوں کا کہنا ہے کہ ابھی یہ نظام اپنے عبوری دور سے گزر رہا ہے۔ اور ارتقاء و تغیر کے متعدد مرحلے طے کر چکنے کے بعد اپنے اس نظریاتی معیار تک پہنچے گا۔ یہ بات کہ اشتراکی نظام آئندہ چل کر کبھی اپنے دعوے اور وعدے کے مطابق ایسا سماج پیدا کر بھی سکے گا؟ اس وقت تو دکھانا صرف یہ تھا کہ اشتراکیت ابھی تک، ایک دن کے لیے بھی اپنی معیاری شکل میں کہیں قائم اور نافذ نہیں ہو سکی ہے۔ یہ بات واقعات کو بھی تسلیم ہے اور اشتراکیت کے ایک ایک حامی اور علمبردار کو بھی۔

دوسرے نظاموں کے اس جائزے سے صورت واقعہ کیا قرار پائی؟ یہی نا کہ دنیا کے قابل ذکر نظاموں میں سے اگر کوئی نظام اپنے معیاری رنگ میں قائم اور نافذ ہو سکا ہے تو وہ صرف اسلامی نظام ہے۔ اس کے سواد نیا کسی دوسرے ایسے نظام سے واقف نہیں جو تھوڑی مدت کے لیے بھی اپنا مثالی کردار پیش کر سکا ہو۔ اس لیے اگر کسی نظام کا معیاری قیام و نفاذ ہی اس کے قابل قبول ہونے کی دلیل ہے تو یہ دلیل صرف اسلام کے پاس ہے اور اس کی اس امتیازی حیثیت کو کوئی اور نظام چیلنج نہیں کر سکتا۔ اس حقیقت کی موجودگی میں یہ بات بھی کتنی عجیب بات ہو گی کہ اسلامی نظام کا قیام چونکہ بہت تھوڑے دنوں رہ سکا تھا اس لیے اب اسے دوبارہ قائم کرنے کی جدوجہد ایک فضول جدوجہد ہو گی۔

۴۔ تربص کا رویہ

اب ان حضرات کے افکار کا جائزہ لیجیے جو تربص کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں اور خود سلامتی و بے فکری کے محفوظ گوشوں میں بیٹھے ہوئے دوسروں کی ثابت قدمی اور تیز گامی کا حساب لگا رہے ہیں اور اسی کام کو اپنی زندگی کا اصل فریضہ کہنے کے باوجود میدان عمل میں اس لیے نہیں اترتے کہ پہلے سے میدان میں اترے ہوئے لوگوں کی عزیمت انہیں مشکوک نظر آتی ہے۔